میرے لوگ
زندہ رہیں گے
لیلیٰ خالد کی آپ بیتی
ترجمہ
کشور ناہید

فلسطینیوں کی قربانیوں
کو خراجِ تحسین
مکتبہ عالیہ کی جانب سے

ناشر: محمد جمیل النبی
طابع: بختیار پرنٹرز
قیمت: ۲۵/-

میرے لوگ زندہ رہیں گے

لیلیٰ خالد کی آپ بیتی

ترجمہ:

کشور ناہید

مکتبہ عالیہ ○ لاہور

ماں میں اپنا راز نہیں چھپا سکتی
مجھے فلسطین کے علاوہ اور کسی سے عشق نہیں
میں اپنی محبت میں ثابت قدم ہوں
میرے لوگ بھی جبر اور تشدد سے خوفزدہ نہیں
میری محبوبہ میری سرزمین!
میرے شہیدوں کو یاد رکھنا
میرے اِن ہاتھوں کو یاد رکھنا
جنہیں تیرے نام پہ اٹھنے کی پاداش میں قلم کر دیا گیا
سارے مصائب کو انقلابی استقامت کے ساتھ برداشت کرو
تشدد ابھی ہمارے راستے میں حائل ہے
سرزمین وطن کی واپسی مستقل مزاجی چاہتی ہے
ہم اپنا سر نہیں جھکائیں گے
دشمن چاہے قوی ہو
ہم قوی تر ہیں
ہمارا مقصود واضح اور مبنی بر انصاف ہے
ہمیں خود میں اعتماد پیدا کرنا ہوگا
ہمیں خود کو خوف سے آزاد کرنا ہوگا
اے میرے لوگو! میرا انتظار کرو
اے میرے لوگو! فتح کے منتظر رہو
ہم فلسطین واپس جائیں گے
واپس جائیں گے!!

(لیلیٰ خالد کی نظم کا اقتباس)

انقلاب کی معنویت نفرت کے فروغ اور ماضی میں یقین سے حاصل نہیں ہوتی یہ کیفیات تو انقلابی تحریک کو کچوکے لگانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ہمیں محبت اور مستقبل کی بالیدگی ہی انقلاب کا منزل پر لا سکتی ہے۔

غسن کنفانی ———

مدیر "الحدف"

ترتیب

حرفِ آغاز

لیلیٰ خالد کی آپ بیتی، گلب پاشا کے تعارف اور امریکہ میں شائع ہونے کے باوجود میں نے ترجمہ کی ہے۔ سبب یہ ہے کہ علاوہ اس فوقیت کے، کہ لیلیٰ کے حوالے سے فلسطین کی تحریک آزادی کا جامع جائزہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ فلسطین کی تحریک اور سامراجیت کے خلاف پر عمومی رویے یا مزاحمت کی پالیسی کو کچلنے کے لیے جسطرح رجعت پسند قوتیں مجتمع ہوتی ہیں۔ اس کا واقعاتی تجزیہ، لیلیٰ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

لیلیٰ کی آپ بیتی لیلیٰ نے خود تصنیف نہیں کی، ریکارڈ کرائی۔ اس لیے بولتے ہوئے کئی دفعہ واقعات دہرائے جاتے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ جارج حجاز نے ۲۰ گھنٹے، جو پانچ دن پر محیط ہیں۔ ان یادداشتوں کو ریکارڈ کیا۔ اور پھر تحریر کیا۔

لیلیٰ کا یہ تجزیہ ۱۹۷۰ تک کے حالات پر محیط ہے۔ آج کی صورت ۱۹۸۵ کی سیاسی آلودہ فضا سے مختلف نہیں۔ وہی سامراجی بڑی طاقتیں۔ وہی عرب رجعت پسند قوتیں۔ وہی مسلمانوں کی دشمن کے مقابلے میں آپس میں ہی لڑنے کی عادت اور وہی سازشی ہاتھ کہ جس کے ایک طرف صلحتی فارمولا اور دوسری طرف جنگی منصوبہ درج ہے۔

لیلیٰ پاپولر فرنٹ کی ممبر ہیں اور پی۔ ایل۔ او سے بوجوہ اختلافات رکھتی ہیں۔ مگر موجودہ جنگ (یعنی ۱۹۸۲ء کی جاری جنگ) میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر

پہلا حصّہ

زینہ

جارج حبش اور ان کے ساتھیوں نے پی۔ ایل۔ او کی کارروائیوں اور استقامت پر صاد کرتے ہوئے، یاسر عرافات کی رہنمائی کو تسلیم کیا ہے۔ چونکہ میرا منصب مصنفہ کے موقف کو تبدیل کرنا نہیں۔ اس لیے اس کے خیالات بجنسہٖ رقم کر دیے ہیں۔ تحریر میں جا بجا جذباتی پیکر، میری اختراع نہیں، لیلیٰ خالد کا جنون کی حد تک سرزمینِ فلسطین سے عشق کا اظہار ہے۔

سرزمینِ فلسطین کی یہ جنگ جاری ہے۔ میں بھی اس جنگ میں حصّہ لینے کو بیتاب تھی۔ یہ ترجمہ اسی شوقِ فلسطین کی آبرو کے لیے کیا ہے۔

کشور ناہید

۲۳۔ جولائی ۸۴ء

کی عافیت، سمندروں کا وصال اور میدانوں کی وسعت کا قرب نصیب ہوا ہے۔ دھوپ کی سنہری ڈلی اسی زمین پہ اپنا حسن ارزاں کرتی ہے، مگر مجھے اس دھوپ کو دیکھنے، اس ہوا کے ساتھ چلنے اور ان لوگوں کے ساتھ سانس لینے کا اختیار نہیں ہے۔ یورپی یہودی اور ان کے ساتھی اسلحہ کے بل پر اِس زمین پر قابض ہیں اور ہمیں بیدخل کیا ہوا ہے۔ ہم خانہ بدوش ہیں، جلاوطن ہیں اور وہ غاصب ہوتے ہوئے بھی مالک بنے ہوئے ہیں۔ وہ میرے شہر میں اس لیے رہ رہے ہیں کہ اوّل تو وہ یہودی ہیں اور دوسرے طاقت ان کے ساتھ ہے اور ہم فلسطینی عرب، نہتّے اور بغیر اسلحہ کے ہیں۔ مگر صحرا کے بیٹے ہمارے سپوت، اس عزم کے ساتھ زندہ ہیں کہ ہم قوت بھی حاصل کریں گے اور فلسطین بھی کہ پھر اُسے عربوں کے لیے انسانی جنت اور آزادی کے جیالوں کے لیے خیالی سرزمین بنائیں گے۔

مجھے اپنے خاندان اور تمام فلسطینیوں کی طرح حیفا پسند ہے۔ شروع شروع میں حیفا کے لیے میرا عشق جذباتی تھا۔ جیسا کہ خواب ناک سرزمین کے لیے بچے کے جذبات ہوتے ہیں۔ جیسے میں بڑی ہوتی گئی اپنے بارے میں سوچ اور علم بڑھتا گیا۔ مجھے علم ہوا کہ میری تو تاریخی جڑیں ہیں اور میرے لوگوں کی تو جلد جلد سے بھرپور تاریخ ہے اور میری قوم، اگر دوسری قوموں سے برتر نہیں تو مساوی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ مجھے یہ بھی یقینِ واثق ہوا کہ میرے طبقے کے لوگ اور کارکن، بے کار، مہاجر اور استحصال کا شکار لوگ ہی پوری قوم کو قدامت کی پستی سے نکال کر جبر سے آزاد کرا سکتے ہیں۔ مجھے سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا تھا، مجھے وہ فراموش کر کے آگے بڑھنا تھا۔ پڑھایا تو یہ گیا کہ ہماری کوئی تاریخ نہیں ہے کہ فلسطینی کوئی قوم کوئی عرب نسل لوگ نہیں ہیں۔

(۱)

میرا تعلق حیفا سے ہے مگر مجھے اپنی جائے پیدائش بہت کم یاد ہے۔ میرے ذہن میں وہ جگہ محفوظ ہے کہ جہاں میں ایک چھوٹی سی بچی کی حیثیت سے کھیلتی تھی۔ گھر بھر میں مجھے صرف زینہ یاد ہے۔ میں جب چار سال کی تھی تو مجھے حیفا سے باہر لے جایا گیا تھا کہ ایک عمر تک اپنے آبائی شہر کو دیکھنے کو ترسوں۔ آخر کو ۲۱ سال بعد ۲۹ اگست ۶۹ء کو میں نے دوبارہ حیفا کو دیکھا جبکہ میں اور کامریڈ سلیم عیساوی نے ایک سامراجی جہاز پر قبضہ کر کے فلسطین آئے تاکہ دشمنوں کے قبضے میں دبے ملک کو خراجِ عقیدت پیش کر سکیں اور یہ بھی اس پر واضح کر سکیں کہ ہم نے اپنے آبائی وطن کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کمزور اسرائیلی دشمن نے ہمیں امریکی اور فرانسیسی جہازوں کے دستوں کے درمیان پابند کئے، ہماری سرزمین پر اتارا۔

حیفا کے بارے میں مجھے اپنے دوستوں، والدین اور کتابوں کے ذریعہ ہی علم تھا۔ اب میں نے خلاء ہی سے اپنی سرزمین کی رنگت کو محسوس کیا اور اپنے آبائی وطن کے بارے میں خیالوں کی پرچھائیاں مرتب کیں۔ حیفا کو پہاڑوں

علم کی جستجو مجھے اس محاکے پہ لے آئی جہاں مجھے علم ہوا کہ خود ساختہ مؤرخوں نے کس طرح ہمارے کردار، ہماری قابلِ ذکر شہادتوں اور کارناموں کو نفی میں بدل کر ہماری تکذیب کی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھے تاریخ میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا ناقابلِ گریز کردار، جارح اور مظلوم کے درمیان لڑائی میں قابلِ فیصلہ مقام کی تلاش تھی۔ میں اپنے عوام اور خود اپنی ذات کو آزاد کرانے کے لیے انقلابی بن گئی۔

میں دراصل ۱۹۳۰ء کے ایک فلسطینی انقلابی سے بہت متأثر تھی۔ ازدین کسم جس نے عرب میں سب سے پہلی کوشش 'باضابطہ اور منظم طریقے پر مزدور اور کاشت کار کے انقلاب کو روبہ عمل لانے کی کی۔ اس سلسلے میں وہ عرصہ دراز تک خفیہ کارگزاری میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۵ء میں لوگوں کی مسلسل غداری اور نصب العین سے غفلت کو دیکھتے ہوئے، انہوں نے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا یہ جدوجہد برطانوی سامراج، یہودیت اور عرب قدامت پرستی کے خلاف تھی۔ انقلابیوں میں مزدور، کسان اور طلبہ اور دوسرے ترقی پسند لوگ شامل تھے۔ بغاوت، مظلوموں کی بغاوت کہ برطانوی سامراج نے یہودیوں اور عرب رجعت پسندوں کی مدد سے فلسطینیوں کو محکوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان، فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا جبکہ مؤرخ اسے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان کی بات قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں کسانوں کی ہڑتال۔ اپریل سے اکتوبر تک جاری رہی، مقصد یہ تھا کہ فلسطین اور عرب، شناخت کے مراحل کو مستحکم کر کے جمہوری اقدار کے فروغ کی کوشش کی جائے اور یوں فلسطین سے یہودی نقل مکانی کرنے والوں اور برطانوی

آلہ کار لوگوں کو باہر نکال دیا جائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو سامراجی چاہتے ہیں۔ رائل کمیشن ۱۹۳۷ء میں قائم ہوا جس نے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ فلسطین کی مدافعت ایک کمیٹی نے کی، جس کی سربراہی شاہ عبداللہ اور برطانوی کر رہے تھے۔ منصوبے کو تسلیم کر لیا۔ انقلابی تحریکیں اور زور پکڑ گئیں مگر خود فلسطینی غدّاروں کے ہاتھوں کہ جن کی پشت پناہی عرب حکومت کے معتمدین اور برطانوی یہودی فوجی شاطر کر رہے تھے، یہ تحریک پسپا ہوئی کسم شہید کر دیئے گئے۔ یہ یقین پختہ ہوا کہ انقلاب بہرحال اس علاقے کا مقدّر ہے۔ مگر دشمنوں نے انقلاب کا سورج فی الوقت غروب کر دیا اور کسم کی کردار کشی کی مذموم حرکت کی گئی۔ فلسطین کی آزادی کا پاپولر فرنٹ کسم کی شہادت کے بعد وجود میں آیا۔ اس کی نسل نے انقلاب کا آغاز کیا تھا اور میری نسل انقلاب کو مکمل کرے گی۔

میں نے ۱۹۳۶ء رستخیز کی کہانی زیادہ تر کتابوں میں پڑھی۔ مگر میں اپنے ذاتی تجربات کے حوالے سے ۱۹۴۸ء سے اپنے لوگوں کی زندگیوں کی تلخیوں سے آگاہ ہوں۔ میں نے اپریل ۱۳، ۱۹۴۸ء کو اپنی چوتھی سالگرہ کے صرف چار روز بعد حیفا کو خیرباد کہا۔ میری سالگرہ نہیں منائی گئی کہ ۹ اپریل کو فلسطین میں یومِ ماتم تھا۔ اب میں ۲۹ برس کی ہوں۔ میں نے آج تک اپنی کوئی سالگرہ نہیں منائی اور اس دن تک نہیں مناؤں گی جب تک میں حیفا پھر واپس نہیں چلی جاتی کہ میں نے حیفا کو اپنی خواہش سے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ فیصلہ میرے خاندان نے نہیں بلکہ ان لوگوں نے کیا تھا جو میری اور میرے بھائیوں کی نسل کشی کا آلۂ کار بنے۔

میرے خاندان کے یہودی ہمسایوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔ ہم سٹینٹن سٹریٹ میں رہتے تھے کہ جو یہودی کوارٹر صدر سے بہت قریب تھے یہ علاقہ حیفا کے فیشن ایبل پانچویں ایونیو میں شمار ہوتا تھا۔ میری یہودی بچوں

سے شناسائی تھی۔ میری سب سے اچھی سہیلی تمارا یہودن تھی۔ مگر اس وقت ہمارے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔ مجھے عرب اور یہودی کے فرق کا علم نہ تھا۔ میرے اور تمارا کے تعلقات میں تبدیلی کا موڑ تو ۲۹ نومبر، ۱۹۴۷ء کو آیا، جب اقوامِ متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے مجھے اور تمارا کو الگ الگ کر دیا۔ تمارا کے حصے میں ۵۶ فیصد علاقہ آیا (جبکہ یہودیوں نے اپنے اعداد و شمار کے مطابق صرف ۸ فیصد علاقے کا مطالبہ کیا تھا) مجھ سے یہ توقع تھی کہ میں اس مطالبے کو مان لوں گی اور تمارا کے ہم نسلوں کو مبارکباد پیش کروں گی۔ مجھ سے میری انسانیت کے انکار اور یہودیوں کی اخلاقی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے اور خود کو اپنے ہی گھر میں اور اپنی ہی سرزمین پر مہاجر تسلیم کرنے کو کہا جا رہا تھا۔ عالمی یہودیت، امریکی سامراجیت اور ان کے حواریوں نے، میرے عرب ہونے کی بنا پر میرے لیے جلا وطنی کی زندگی مقدر کی۔ پھر ان مطالبہ تھا کہ ان کا یہ فیصلہ ہم مانیں بھی کہ ہمارا تسلیم کرنا گویا یہودی مطالبے کو حقیقی اور ان کی توسیع پسندی کو مکمل کرے گا اور ان کے ہجرت کرنے والے ایک دفعہ آکر آباد ہو جائیں تو یوں معاملات باقاعدہ طے پا جائیں گے۔

اقوامِ متحدہ کے فلسطین کو تقسیم کرنے کے منصوبے کے اعلان پر تین روزہ عام ہڑتال ہو گئی۔ مگر یہ ہڑتال قطعی بے اثر تھی۔ عرب قومی تحریک قطعی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا محض جن باقی تھا کہ جو غیر منظم اور جذباتی ریوڑ سے زیادہ نہ تھا۔ روائتی ادارے مضبوط ہو چکے تھے۔ کارکنوں اور کسانوں کی نئی تنظیمیں اتنی پختہ کار نہیں ہوئی تھیں کہ قومی آزادی کے عظیم کام اور مقصد کی غایت کو پورا کر سکیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا عرب، یہودیوں کو مار رہے تھے۔ یہودی، عربوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ البتہ یہودیوں کی جارحیت منظم اور بامقصد تھی جبکہ عربوں کی جارحیت انفرادی اور غیر منظم

تھی۔ یہودیوں کے پاس لڑنے والے بھی تھے اور اسلحہ بھی۔ ان کی مسلح افواج بھی تھی اور نفسیاتی طریقِ جنگ سے وہ آشنا بھی تھے۔ اس لیے یہودی ہم سے حیفا چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ عربوں کے کمانڈر سر جان گلب پاشا[1] کہ جن کا تعلق اردن سے تھا، نے اپنی حیفا رجمنٹ کو حیفا خالی کرنے کا حکم دیا کہ یہ حکم برطانوی منصوبے کی مطابقت میں حیفا کو خالی کرنے اور یہودی فتح کو مکمل کرنے کی جانب قدم تھا۔

تنظیم کے ہونے اور دفاعی سوجھ بوجھ کے باعث، یہودیوں کو اندازہ ہوا کہ کم وقت، محنت اور افراد صرف کر کے، وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں حیفا کے ۸۰ ہزار عرب اپنی جان کی حفاظت کو مقدم سمجھتے ہوئے شہر خالی کر گئے یہ انخلا ۹ اپریل یعنی میری سالگرہ کے دن شروع ہوا۔ یہودیوں نے دیر یاسین کے لوگوں کا سفاکانہ قتلِ عام کیا۔ یہ وہ بہیمانہ جرم تھا کہ جس نے یہودی سفاکیت کو کو واضح اور عربوں کو بے چون و چرا شہر سے رخصت ہونے پر مجبور کیا۔

حیفا کی سرزمین پر ۲۵۴ افراد کا قتل اور سینکڑوں عربوں کے زخمی ہونے کا اندازہ نہ دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی اور لوگوں کا قتل بھی ہو گا۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ دو دن بعد یہ ہراس میرے سامنے بھی مجسّم ہوا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موت دیکھی۔ مجھے یاد نہیں میرے سامنے مرنے والا یہودی تھا کہ عرب مجھے صرف بم کا دھماکہ اور مرنے والے کے پیٹ سے بم لگنے کے باعث خون کا ابلنا یاد ہے۔ میں سیڑھیوں کے نیچے چھپ گئی اور گلی میں پڑی لاش کو گھورتی رہی۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو رہی تھی کہ کیا میرے باپ کا مقدر بھی یہی موت ہے۔

خوف و ہراس کے اس ماحول نے ہمارے خاندان کو بھی نقل مکانی پر مجبور کر دیا۔ ہم سب آٹھ تھے۔ ۱۳ اپریل ۴۸ء کو ہم سور کی جانب روانہ ہو گئے۔ مجھے کسی

[1] یہ وہی گلب پاشا ہیں کہ جنہوں نے اس کتاب کا تعارف لکھا۔

نے نہیں بتایا کہ ہم کیوں جا رہے ہیں اور نہ میری سمجھ ہی میں آیا۔ اماں نے کرائے کی ایک گاڑی میں ہمیں اور کچھ سامان کو لاد کر بے ہوشی کے عالم میں روانہ کر دیا۔ ذرا آگے گئے تو پتہ چلا کہ ہم میں سے ایک کم تھا۔ چیخ و پکار مچی۔ یہ میں تھی کہ جس کا کسی کو پتہ نہیں چل رہا تھا بڑی دیر بعد میری دو بہنوں نے مجھے کھجوروں کے ڈبے کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ لیا اور آلوؤں کے تھیلے کی طرح مجھے گردن سے دبوچ کر ماں کے سامنے پیش کیا۔ جنہوں نے چلا کر کہا، اگر تم نہیں آئیں تو یہودی تمہیں مار ڈالیں گے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے بال بھی کھینچے۔ میں بہت ناراض تھی اور اب بھی نہیں جانتی تھی کہ آخر ہم حیفا چھوڑ کر صور کیوں جا رہے ہیں۔ میرے والد نے سب کو آنسو بھری آنکھوں سے الوداع کہا اور وہ وہیں رہ گئے۔ مجھے یاد ہے سفر کے آغاز سے دھندلا ہونے تک، میری آنکھوں میں بس ایک چیز تھی۔ اپنے گھر کی سیڑھیاں۔

میں کئی ماہ تک اپنے باپ سے نہیں ملی۔ جب وہ صور آئے تو بالکل پژمردہ تھے وہ کسی قیمت پر حیفا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر حیفا کے یہودیوں کے قبضے کے فوراً بعد ۲۲ اپریل کو ابا کو بزنس اور حیفا دونوں کو چھوڑنا پڑا۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہودی ہمارے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ہمارے گھر کا فرنیچر کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ اب ابا کو مصر منتقل کر دیا گیا۔

تین چار ماہ مصر اور دیگر جگہوں پر خوار ہونے کے بعد، بہ دقّت تمام خوار و زبوں اور کوڑی کوڑی کو محتاج ابا آخر کو صور پہنچ گئے۔ تیس سال تک سٹور کیپر کی حیثیت سے شبانہ روز کام کرنے والا پیسے پیسے کو محتاج تھا۔ وہ اس بات پر بھی بہت افسردہ تھے کہ لبنان کی شہریت ان کو نہیں ملی تھی۔ وہ ۱۹۶۶ء یعنی اپنی وفات کے وقت تک لبنان میں جلا وطن کی حیثیت سے رہے۔ ۱۸ سال تک وہ حیفا واپس جانے کے خواب کے ساتھ زندہ رہے ہیں۔ اپنے باپ کی بیٹی کی حیثیت سے، اپنے باپ کا

خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے باپ اور قوم کے خوابوں کو نابود نہیں ہونے دوں گی۔ اگر میں فلسطین جانے اور آزاد فلسطین میں رہنے تک زندہ نہیں رہوں گی تو میری اولاد یقیناً وہ زمانہ دیکھے گی۔

مغربی مؤرخین اور محققین یہ لکھتے ہیں کہ حیفا کے لوگ، یہودی میئر کے اس اعلان کے باوجود کہ باہمی اعتماد اور افہام و تفہیم سے دونوں نسل کے لوگ رہیں گے۔ عربوں نے حیفا سے نقل مکانی کی۔ فرض کر لیجئے کہ اگر میئر کا اعلان خلوص پر مبنی ہوتا تو کیا وہ کشت و خون رکوا سکتا تھا کہ جو شروع ہو گیا تھا۔ کیا یہودیوں کا علاقے پر قبضے کا جنون کم ہو سکتا تھا اور کیا عربوں کو زک پہنچانے کے مذموم ارادوں میں کمی آ سکتی تھی۔ اگر ایسا ممکن تھا تو میرے بھائیوں کا قتل اور میری بہنوں کی عصمت دری کیوں ہوئی؟ اگر ایسا ممکن تھا، تو "معصوم" برطانوی" حکام نے سینکڑوں چھوٹی کشتیاں کیوں فراہم کیا کہ حیفا سے صور تک فلسطینیوں کو لے جایا جا سکے۔ اگر ہم رضاکارانہ طور پر گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تو آخر کون سی مجبوری تھی کہ جس کے تحت یہودیوں نے ہماری املاک، مال و اسباب اور ہر قابلِ ذکر چیز پر قبضہ کر لیا یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب ہر قابلِ عزت یہودی اور اسی مؤرخ کو تلاش کرنا ہو گا کہ جسے اپنے لفظوں کی حرمت کا اعتبار ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربوں کا مقصود یہ تھا کہ حیفا پر دوبارہ قبضہ کیا جائے۔ یہودیوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے اور اس مقصد کے لیے، عرب ملکوں نے کوئی بیس ہزار نفوس کی افواج کو منظم بھی کیا۔ مگر وہ نہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھیں نہ ان کے پاس جدید ہتھیار تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ساٹھ ہزار تربیت یافتہ یہودی تھے۔ عربوں کی کوئی مرکزی قیادت اور کوئی اخلاقی تحریک نہ تھی۔ اگر کوئی کارنامہ ہو جاتا تو یہ اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی عمل ہوتا۔ ان کے بقول، عرب افواج تو مردہ سماجی

ڈھانچے کی قربانی دینے کی طرح تھیں کہ جو جدید تربیت یافتہ دشمن کے مقابل ایک ریوڑ کی طرح دھکیل دی جاتی تھیں۔ اب بھی باور کیا جاتا تھا کہ وہ جیت جائیں گے عربوں کا یوں حملہ آور ہونا، اقوامِ متحدہ کے پیدا کردہ فلسطین کے مسئلے کو زندہ رکھتا تھا اور یوں عرب بادشاہ اور اس کے لواحقین کی امداد سے، بقیہ فلسطین کو اردن میں شامل کرنے کا قطعی جواز بنتا تھا۔ عربوں کی مداخلت نے یہودیوں کو ناقابلِ تسخیر ہونے کا اعتماد بھی دیا۔

---

(۲)

لبنان آنے کے بعد میں جب بھی کسی درخت سے نارنگی توڑتی۔ اماں کی ڈانٹ پڑتی، میں تنگ آ کر پوچھتی "اماں تم منع کیوں کرتی ہو۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتی تھیں" اور اماں آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں "بیٹا! تم جیفا میں نہیں ہو۔ یہ باغ تمہارا نہیں ہے۔ تم اب دوسرے ملک میں ہو۔" اس سے پہلے کہ میں اندر بھاگ کر آنسو پونچھتی۔ وہ میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اعتماد کے ساتھ کہتی "اب تم نارنگیاں نہیں توڑو گی، جن پر ہمارا حق نہیں ہے۔" میں بچپنے کی معصومیت کے ساتھ اقرار میں سر ہلا دیتی۔ مگر والدہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے۔ پہلی دفعہ جلا وطنی کی ناانصافی کا سوال میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

چار سال کی عمر میں ہی میرے سامنے حق و باطل، زندگی و موت جیسے سوال پریشان کرنے لگے۔ میں وہ تھی کہ جو اقوامِ متحدہ کے دیئے گئے راشن کارڈ پر روٹی کی حق دار تھی اور ایک کمرے میں آٹھ افراد کے اس خاندان میں گھٹی گھٹی سانسوں کی اجازت میں اندر ہی اندر یہودی غیر انسانی رویوں کا زہر اپنی زبان پر محسوس کر رہی تھی۔ میرے اندر

کی دنیا کے تہہ و بالا ہونے پر میری شخصیت میں طوفان کا سا خروش تھا۔

میں اپنے خاندان کے ساتھ مایوسی کے دن اور قنوطیت کی راتوں کو زندگی سمجھنے پر مجبور تھی۔

۱۹۴۸ء کے موسمِ سرما کی ایک ہی یاد کافی ہے۔ میں اپنی بہنوں نول، رقیہ اور رباب کے ساتھ اقوامِ متحدہ کے ریلیف کیمپ میں راشن لینے کے لیے گئی۔ میری بہنوں کو تنگ کیا گیا۔ میری ماں سخت ناراض ہوئی۔ ہم کہ بین الاقوامی خیرات پر زندہ تھے۔ یہودی فلسطین میں ہماری محنت کا پھل کھا رہے تھے۔ میرے مغربی دوست بتاتے ہیں کہ یہودی کہتے ہیں کہ جب ہم نے فلسطین پر قبضہ کیا تو یہ بے آب و گیاہ صحرا اور مچھروں کی یلغار کی بستی تھی۔ انہوں نے اسے لہلہاتے کھیتوں اور سونا اگلتی وادیوں میں بدل دیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی تو امن چاہتے ہیں جبکہ عرب خانہ بدوش مستقل حملے کرتے، چوریاں کرتے اور فلسطین کے علاقوں میں آگ لگاتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۸ء کے موسمِ خزاں میں مجھے شرارتوں سے بچانے کے لیے شیخ مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ میرے اندر لڑکوں کی طرح کھیلنے اور جارحیت کی خاصیت تھی۔ میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتی اور لڑتی تھی۔ میری استاد زینہ، مستعد بوڑھی عورت تھی کہ جسے بچوں سے بے پناہ پیار تھا اور جس نے ساری زندگی بچوں کی تربیت ہی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ مگر بچوں کو اس کے لمبے لمبے خطبے اچھے نہیں لگتے تھے۔

ہمارا سکول پڑھنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا یہ تو صرف وقت گزارنے کا عمل تھا۔ مگر زینہ نے تو ہمیں سنجیدگی سے قرآن بھی پڑھانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ابھی ابجد سکھائے بغیر اس نے پانچ سے چھ سال کی عمر کے بچوں کو قرآن کے کچھ حصے حفظ کرنے کے لیے بھی کہا۔ ہم نے کیا بھی۔ شیخ سکول سے گریجویشن کرنا، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہر

پاس ہونے والے کو عوام کے سامنے قرآن کے حصے قرأت کے ساتھ سنانے ہوتے تھے۔ میں حضرت یوسف کا قصہ مزے لے کر پڑھتی کہ وہ کس طرح مصر کی جانب بھاگے اور کیسے فرعون نے ان پر حکم لگائے اور سزائیں تجویز کیں۔

بچے اور استاد، سب میرے قرآن پڑھنے کو سن کر بہت خوش تھے میں خود بھی اعتماد میں تھی۔ میں نے جیسے ہی قرأت ختم کی، ایک بچہ بھاگا بھاگا میری ماں کے پاس گیا کہ اس قرأت کا انعام میری ماں بھی دے۔ میری غریب ماں نے گھر پر رکھی کچھ مٹھائی دے دی۔ جب میں نے گھر آ کر اپنی گریجویشن اور کامیابی کا احوال سنایا تو ماں نے مجھے بھی تھوڑی بہت مٹھائی اور بہت خوبصورت بوسہ دیا۔ مجھے خیال تھا کہ ماں مجھے انعام میں بڑا سا تحفہ دے گی۔ میں انعام پا کر رد پڑی۔ یہ خیال کئے بغیر کہ غریب ماں کی ممتا کو لباس، گڑیا، جوتے یا جرابوں جیسی سونے کی ڈنڈیوں میں تولنا نامناسب ہے۔

میرے ماموں کہود کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے اس کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے میرا امتحان لیا اور بہت متأثر ہوئے۔ ان کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ چھ سال کی بچی کو قرآنِ پاک کے اتنے سارے حصے حفظ ہیں۔ انہوں نے انعام کے طور پر مجھے پورا ایک لبنانی پونڈ دیا جو کہ ۲۵ پینس کے برابر تھا۔ میری زندگی کی یہ پہلی کمائی تھی۔ میں نے خوش ہو کر ماموں کا منہ چوم لیا اور بھاگی بھاگی آئی ماں کو اپنی کامیابی کا واقعہ بیان کرنے اور اس کی ناانصافی اور کنجوسی کے بارے میں دہائی دینے۔ ماں نے میرا سارا بیان بڑے حوصلے سے سنا اور میرا پونڈ لوٹاتے ہوئے بولی تو یہ تمہارے ماموں نے دیا ہے۔ تم جیسے چاہو خرچ کر دو۔ میں نے اس پونڈ سے اپنی استاد کے لیے تحفہ اور بچوں کے لیے مٹھائی خریدی۔

۱۹۵۹ء کی خزاں کے موسم میں فلسطینیوں کے لیے قائم ایونجیلیکل چرچز سکول

کی پہلی کلاس میں میرا داخلہ ہوا۔ اس سال گرمیوں میں، میں نے اپنی بہنوں کو قرآن
پڑھتے ہوئے بڑے غور سے سنا اور جیسے جیسے میں قرآن سنتی جاتی تھی۔ اس کی تصویر
آنکھوں میں بناتی جاتی تھی۔ میں ذقیہ کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ جو وہ کرتی تھی میں
بھی وہی کرتی تھی۔ جو اُسے یاد تھا وہ مجھے بھی یاد تھا۔ وہ سکول میں چوتھی کلاس
تھی۔ میں اُسی کلاس میں جانا چاہتی تھی۔ پھر میں نے اُسی کلاس میں داخلے کی ضد اس
لیے بھی کی کہ پہلی دو کلاسیں شامیانے کے نیچے زمین پر بیٹھ کر ہوتی تھیں۔ مگر استاد
نے مجھے پھر پہلی کلاس میں داخل کیا۔ میں غصے سے بے قابو ہو کر چلائی، میرا امتحان لے لو
اور پھر بات کرو، میں چوتھے گریڈ کی عربی بغیر کسی غلطی کے پڑھ سکتی تھی۔ پھر استاد
نے میرا میتھمیٹکس کا ٹسٹ لیا۔ یہ بھی مجھے پاس ہونے کے لائق آتا ہی تھا۔ البتہ انگریزی
میری ناکامی کا سبب بنی۔ مجھے انگریزی کے بنیادی حروف اور چند وہ الفاظ آتے تھے
جو میری بہن کو آتے تھے۔ جب استاد نے بلیک بورڈ پر '۵' لکھا۔ میں نے اُسے
عربی کا 'پانچ' سمجھا۔ استاد تو ہنس پڑے اور کہنے لگے 'تم واقعی ذہین لڑکی ہو۔
البتہ تمہارا علم ابھی گریڈ دو کے برابر نہیں ہے۔ میں تمہاری ذہانت دیکھ کر گریڈ ایک
میں داخل کرتا ہوں۔ مجھے ایک طرف تو اپنی ذراسی کامیابی کا احساس تھا تو دوسری
طرف مجھے غصہ تھا کہ مجھے پھر اُسی شامیانے لگی زمین پر بیٹھنے والی کلاس میں جانا پڑے
گا۔ بہرحال اب میں ایک سنجیدہ طالب علم تھی کہ جو عربی کے علاوہ انگریزی، حساب،
کھیل، گانے وغیرہ خوب سیکھ رہی تھی۔ اب میں سلیٹ پر لکھنا بھی جانتی تھی۔ ماں نے
اپنے پھٹے پرانے لباس کو کاٹ کر، ایک سکول بیگ میرے لیے بنا دیا تھا اور میں اپنے
اس سرمائے پر اتراتی اتراتی پھرتی تھی۔

سکول کے ان ابتدائی دو سالوں میں، میں جلاوطنی کی زندگی کی عادی ہو گئی۔ ان
دو سالوں میں صرف ایک مظاہرہ ہوا کہ جس میں فلسطین کی یاد کا زخم پھر ہرا ہوا۔ ہرچند

مجھے فلسطین کے قصے کا اب باقاعدہ علم تھا۔ مگر مجھے یوں لگا کہ ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ہونے
والا مظاہرہ گویا میری پڑھائی کے معمول میں خلل اندازی کے مترادف تھا۔ سکول میں اس
موقع پر چھٹی ہو گئی تھی مگر میں نے اس سلسلے میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ میں نے اپنی ماں
سے مظاہرے کا مطلب پوچھا اور مقصد پوچھا کہ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں اپنے
ہم عمروں میں اکیلی بچی تھی جو مظاہرے میں شامل نہ تھی۔ میری ماں نے غصے سے کہا
تمہیں اپنی بہنوں کے ساتھ فلسطین پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف مظاہرے
میں شامل ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے اس بات سے تو اتفاق کیا کہ مظاہرہ درست تھا
مگر یہ بھی کہا کہ سکول کا کام اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔ ماں کو میری باتوں سے غدّاری
کی بُو آئی اور مجھے تین اہم غداری کے دنوں کی یاد دلائی کہ جس کا یاد رکھنا ہر فلسطینی
عورت، مرد کے لیے جزوِ زندگی ہونا چاہیئے۔ اول بالفور اعلامیہ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء
دوسرا ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء تقسیمِ فلسطین اور تیسرا ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء اسرائیل کا قیام۔
جب سے آج تک یہ تین تاریخیں میری زندگی میں اہمیت حاصل کئے ہوئے ہیں۔
۱۹۵۲ء میری زندگی میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ ہرچند میں اس وقت محض آٹھ
سال کی تھی مگر حالات کے جبر اور جلاوطنی کی اذیت نے مجھے سیاسی آگاہی بخشی تھی۔
میرے بھائی نے پہلے مجھے سیاست میں ڈالا۔ مجھے اپنے بھائی محمد اور ابا کے درمیان
سیاسی بحث اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت محمد کی عمر ۱۰ سال تھی اور وہ خاندان بھر کو
بتا رہا تھا کہ کس طرح نوجوان اور جوشیلے فوجیوں کی چھوٹی سی جماعت نے مصر کے
بدنامِ زمانہ شاہ فاروق کا تختہ الٹا تھا۔ ابا اس انقلاب کے مخالفین میں تھے اور وہ
کہہ رہے تھے کہ یہ فوجیوں کی جماعت بالکل ناتجربہ کار ہے۔ ان کو نہ سیاست کا
پتہ ہے، نہ انتظامِ مملکت کا اور انہوں نے اس شخص کا تختہ الٹا ہے جس نے فلسطین
کے دفاع کی ۱۹۴۸ء کی جنگ لڑی تھی۔ محمد کو اور بھی غصہ آیا۔ اس نے ابا کو یاد دلایا

کہ بادشاہ تو برطانوی سامراج کا کارندہ تھا کہ جس نے فلسطین میں جنگ ہاری تھی اور چار سال بعد تک فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کی کسی قسم کی سعی نہیں کی تھی علاوہ ازیں بادشاہ اور اس کا خاندان اور حواری تو مصر کی دولت میں عوام سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ سارا خاندان اس بات پر خوش تھا کہ محمد کو سیاست کا ابا سے بھی زیادہ علم تھا۔ محمد نے یہ سارے مسودات مصری رسالے "الیوسف" سے اکٹھے کئے تھے اور اپنے کمروں کی دیواروں پر یہ کٹنگز چسپاں کی ہوئی تھیں۔ اس نے سارے تراشے ابا کو پڑھ کر سنائے۔ ابا نے بڑی محبت اور گرمجوشی سے بیٹے کو اتنی معلومات اکٹھی کرنے پر مبارکباد دی اور انقلاب کے راستے پر قائم رہنے کی دعائیں بھی دیں۔ اب تو محمد ہمارے لیے سیاسی مبصر اور مبلغ ہو گیا خاص کر لڑکیوں نے تو اس سے بہت سیکھا۔ پھر وہ امریکن یونیورسٹی بیروت میں پڑھ بھی رہا تھا اور وظیفہ حاصل کرتا تھا۔ وہاں اس نے خود کو عرب یوتھ موومنٹ سے منسلک کیا جس کے طفیل محمد کو معلومات اور تنظیمی صلاحیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۵۲ء کے موسم خزاں میں مَیں نے اپنے فلسطینیوں کے لیے قائم سکول میں داخلہ لیا۔ یہ سال میرے لیے دریافتوں اور فیصلوں کا سال تھا۔ اگلے تین یا چار سال میں میرے سیاسی اور سماجی خیالات قطعیت اختیار کر گئے اور میں سیاسی طور پر اپنا رخ متعین کر سکی اس کے بعد بہت سے واقعات نے میرے سیاسی شعور کو جلا بخشی، شدید طوفان، برفباری، مہاجر کیمپوں کے لیے چندہ جمع کرنا وغیرہ۔

۱۹۵۲ء کی خوشگوار گرمیاں، دسمبر میں شدید سردی کے روپ میں منقلب ہوئیں طوفان آیا اور وہ شامیانہ اڑا کر لے گیا کہ جس میں ہم ۲۰ لڑکیاں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ کچھ تو زخمی ہو گئیں اور باقی روشنی سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی تھیں۔ چاروں سمت شدید برفانی بارش میں بچیوں کے آنسو اور مٹی ایک ہو رہے تھے۔ اس دوران کہ جب

سارے بچے پناہ کی تلاش میں خوف سے چلاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ میں خاموش کھڑی تھی کہ یہ منظر تو ہماری آبائی زمین کی بربادی کا نقشہ دہرا رہا تھا۔ مقامی طور پر احتجاج اور دل ہلا دینے والی کہانیاں شائع کی گئیں۔ مگر پھر بھی مغربی عیسائی خیرات کی آخر ایک حد تھی کہ نہیں۔ شامیانہ دوبارہ نصب کیا گیا کہ اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔

اس وقت شامیانے کا مطلب میرے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو اب یہ منکشف ہوا کہ دسیوں ہزاروں لوگ شامیانوں میں رہنے پر مجبور ہیں کہ نہ انہیں ہماری طرح پڑھنا یا کھیلنا ہے بلکہ زندگی کرنا ان کے لیے مسئلہ ہے۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں شدید سردی پڑی۔ لبنان اور گلیلی کے پہاڑوں پر برف جمی۔ سارے شہر میں برف کے گالے اور برف کی پھسلن تھی۔ مجھے شدید زکام ہوا مگر گھر میں کوئی دوائی نہ تھی اور مجھے اپنے لوٹے ہوئے سینڈل پہنے سکول جاتے رہنا پڑا۔ فروری کی ایک یخ شام کو تو مجھے تقریباً دو فٹ برف سے گزر کر گھر پہنچنے کی سعی کرنی پڑی۔ میرا سردی کے مارے بُرا حال تھا۔ میں چیختی اور روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ "بس بس بہت ہو گیا۔ مجھے نئے جوتے، نئی جرابیں چاہئیں۔ یہ جرابوں کے بغیر سینڈل، گرمیوں میں پہنے جاتے ہیں، لبنان کی سردی میں نہیں"۔ ماں مجھے غمزدہ آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر دھیمے سے بولی، 'جانی! تم سمجھتی ہو مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے ننھے پیروں کو جرابیں چاہئیں"؟ میں یہ سُن کر اور بھی بپھری" اگر آپ کو پتہ تھا تو آپ نے مجھے جوتا اور جرابیں خرید کر کیوں نہیں دیں؟ اب ماں کو بھی غصہ آیا، چیخ کر بولی" یہ کیا کم ہے کہ دوسروں کے پاس تو کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔ کچھ سمجھیں لیلیٰ بولو۔ بولو نا، "نہیں میں نہیں سمجھی۔ میں نے غصے میں کہا' آخر ان کے پاس سینڈل، کھانا، گھر ..... یہ سب کچھ آخر کیوں نہیں... کیوں نہیں... "۔ "ان کے والدین کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں جتنے ہمارے پاس ہیں۔ ان کے گھر فلسطین میں رہ گئے ہیں اور

یہاں لبنان میں ان کے پاس کرنے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ دیکھو لیلیٰ! وہ فلسطینی کہ جن کے رشتے دار عرب میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ ان کے لیے رہنے کو سوائے کھلے آسمان تلے، خدا کی زمین کے اور کچھ نہیں ہے۔ فرض کرو اگر ہمارے رشتہ دار سوریں نہیں ہوتے تو ہم کہاں ٹھہرتے۔ وہیں نا کھلے آسمان تلے، ان بچوں کی طرح جن کے سر پر سے سکول میں شامیانہ اُڑ گیا تھا اور اگر میرے پاس پچھلے وقتوں کے سونے کے کڑے نہ ہوتے جنہیں بیچ کر تمہیں میں کھانا کھلاتی رہی ہوں۔ تو تم بتاؤ کہ ہم کہاں ہوتے وہیں نا، جہاں ہمارے دوسرے بہن بھائی ہیں۔ ہم کون سے ان سے بہتر ہیں ان سے اعلیٰ ہیں۔ اگر یہودی مجھے اغوا کر کے لے جاتے تو تم، تمہاری بہنوں اور بھائیوں کا کیا بنتا۔ تم لوگ حیفا سے بچ کر نکل سکتے کہ یہودیوں کے مظالم کا شکار ہو جاتے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہودیوں نے کس طرح ہمارے ساتھیوں کو مارا اور جو بچ نکلے وہ بھوک اور سردی کے ہاتھوں لقمۂ اجل ہوئے۔ میری بیٹی! میں تمہیں ہراساں کرنے کو ہزاروں داستانیں اور سنا سکتی ہوں۔ مگر میری جان! صرف اتنا احساس کرو کہ تم ایک غیر سرزمین پر ہو اور تمہاری اپنی سرزمین غیر ملکی قبضے میں ہے۔ ہم...... اس کو بچانے کے لیے بہت لڑے.... مگر شکست ہمارا مقدر ہوئی اور آخر ہمیں اپنے ہی ملک سے نکال دیا گیا۔ تم میری جان میری لیلیٰ اپنی سرزمین کو نہ بھولنا۔ تم... تمہاری بہنیں... تمہارے بھائی ... تمہیں اپنی سرزمین پھر حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا عزم لے کر میدان میں اترنا ہوگا۔"

مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی غیر پر ہونے والے مظالم کی داستان میں مبہوت ہو کر سن رہی تھی۔ میں اس سارے تذکرے سے متاثر ضرور ہوئی مگر مجھے ذرہ برابر یہ احساس نہیں ہوا کہ میں خود اس داستان کا حصہ ہوں یا ہو سکتی ہوں۔ آخر کو ۱۹۵۳ء کے موسمِ بہار نے مجھے یہ باور کرا دیا کہ میں اسی داستان کا حصہ ہوں۔ میری عمر ۹ سال

تھی۔ میں خود کو کلاس کی سب سے تیز لڑکی سمجھتی تھی۔ میری یہ خود پرستی کا بت میری کلاس کی لڑکی سمیرا نے توڑ دیا۔ وہ کلاس میں اوّل آئی۔ میں بہت جلی۔ میرا بس چلتا تو میں اُسے مار ڈالتی۔ میں نے بظاہر اس کی بہت بے عزتی کی۔ مگر ایک دفعہ کلاس میں ہماری لڑائی بھی خوب ہوئی۔ ہم ایک دوسرے کی چوٹیاں کھینچ رہے تھے کہ کلاس ٹیچر آگئے۔ وہ حیران تھے کہ سب سے ذہین لڑکیاں آپس میں ہی لڑ رہی ہیں۔ اس استاد کے سامنے ہم نے لڑائی بند کر دی۔ مگر بعد میں باہر پھر لڑائی شروع ہوگئی۔ اب استاد کو پتہ چلا تو وہ مجھے الگ کمرے میں لے گئے۔ اب جو کچھ اس نے کہا میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ استاد نے کہا کہ غریب کسانوں کے بچے بھی میرے خاندان اور مجھ جیسے بچوں کی طرح ذہین ہو سکتے ہیں اور پھر... یہ بچے ہی تو اصلی فلسطینی ہیں کہ وہ اسی زمین پر رہتے، کاشت کرتے اور فصل اگاتے ہیں۔ یہی ہمارے لوگوں کی بنیاد ہے اور ایسے سادہ لوگ ہی ہماری تہذیب کی بنیاد ہیں۔ لیلیٰ بیٹا! ان لوگوں نے فلسطین خوشی سے نہیں چھوڑا۔ اُن امراء کی طرح کہ جو آج قاہرہ اور بیروت کے عظیم الشان گھروں میں رہ رہے ہیں۔ ان لوگوں کو تو یہودی غاصبوں نے زبردستی نکال باہر کیا ہے۔ لیلیٰ! یہی لوگ اصلی فلسطینی ہیں۔ ان کی عزت کرو۔ ان کو پیار دو۔"

اس لیکچر کے بعد استاد نے سمیرا کو اندر بلایا۔ ہم دونوں کو ہاتھ ملانے کو کہا پھر استاد نے کہا "جاؤ سمیرا! لیلیٰ کو اپنے خیمے، خیمہ بستی اور اپنے ہزاروں ساتھیوں سے ملا کر لاؤ" اور اب میں سمیرا کے ساتھ تھی۔

کیمپ دیکھ کر مجھے احساس ہوا، جیسے میں تو محل میں رہ رہی تھی اور اب مجھے احساسِ رعونت، امراء کے رویوں اور تمام برائیوں کا احساس سیلاب کی طرح امڈتا محسوس ہوا۔ یہیں طبقاتی تضادات میرے ذہن کا حصہ بنے اور جیسے جیسے میں بڑی ہوتی

گئی۔ سماجی امتیازات سے نفرت علم و شعور کا حصہ بنتی چلی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ ہمارے دُکھ ختم ہو سکتے ہیں، اگر سوشلزم آجائے، مگر میرے استاد، سمیرا اور میری کلاس کی ایک سہیلی عامرہ کا خیال تھا کہ پہلے حقیقی آزادی اور سچی انسانیت کا دور دورہ ہو، پھر سوشلزم کی بات کی جا سکتی ہے۔

مجھے ان سب نے چند گھنٹوں میں وہ سکھا دیا جو میں ہزاروں کتابیں پڑھ کر بھی نہیں سیکھ سکتی تھی۔ میں نے فلسطینیوں کے اس کیمپ میں بھوک، افلاس، بے عزتی، امراض، دل شکستگی، لاچاری، ننگے پیر، پھولے ہوئے پیٹ اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے بچے دیکھے۔ سر جھکائے، کمر خمیدہ باپ، زرد رو، سوکھی چھاتیوں سے بچے چمٹائے مائیں اور خلاؤں میں بے مقصد گھورتے بوڑھے والدین کہ نہ ماضی جن کا آسرا تھا اور نہ مستقبل ان کی پناہ تھا۔

یہاں مجھے غربت اور بھوک کا اصل مطلب معلوم ہوا۔ مجھے اپنی ہڈیاں گوشت سے جدا ہوتی محسوس ہوئیں۔ اب مجھے گندے خیموں اور مرتے انسانوں کو دیکھ کر نہ گھبراہٹ ہوتی نہ خوف آتا۔ میں سارے کیمپ میں گھومی، لوگوں سے ملی اور گھر لوٹی تو حقیقت میرے اندر خون میں رچ چکی تھی۔ میں مصلوب بھی ہو گئی تھی اور خود انکشافی کی منزل سے گزر آئی تھی۔ تقریباً ۲ لاکھ مہاجرین ان کیمپوں میں مقیم تھے۔ کچھ نزدیکی علاقوں میں محنت مزدوری کر کے روزی کمانے کی کوشش کرتے، باقی سب بیکاری کے بھوت کو سامنے ناچتا دیکھتے اور بے بس رہتے۔ وہ اقوام متحدہ کی لب سوز خیرات پر زندگی گزارنے کے شرمناک عمل پہ زندہ رہنے پر مجبور تھے، انہیں معلوم تھا کہ عزت کی روٹی عرب فلسطین انقلاب کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اب مجھے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں اعتماد اور بھی قوی ہو گیا۔ بریام کی شام۔ بہت سے بچے ایک ہفتے کی چھٹی کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ زیادہ

بچے گڑیوں، لباس اور تحفوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو اس تہوار کے موقع پر انہیں ملنے کی توقع تھی۔ وہیں خاموش اور اداس ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے بہت بوسیدہ تھے اور وہ بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔ میری واقف نہیں تھی۔ اسلئے میں اس سے پوچھ نہیں سکتی تھی کہ وہ اکیلی بیٹھی کیا کر رہی تھی اور یوں اداس کیوں تھی! نبیل، ہمارے استاد، اس بچی کی مصیبت کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارا تہوار ہے۔ ہم سب بچے تحفے وصول کریں گے اور یہ کس قدر غلط غیر مسلمان حرکت ہوگی کہ ہم اپنی خوشیوں میں دوسروں کو شریک نہیں کریں گے۔ میں یہ سن کر بڑے جوش میں آئی۔ مجھے لگا جیسے وقت آگیا ہے کہ سوریں میں حکومتی دفاتر اور اقوام متحدہ کے دفاتر پر پتھراؤ کر دینا چاہیئے۔ استاد کے یہ فقرے میرے سر میں ہتھوڑے کی طرح بجنے لگے۔ اگر اس بچی کو نیا لباس نہیں ملا، تو تمہاری خوشی بھی بے بنیاد، بے کار ہوگی کہ میں اکیلا اس کو نیا لباس خرید کے نہیں دے سکتا۔ تم سب کو اس کیلئے کچھ نہ کچھ لا کر دینا ہوگا۔ بچوں نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ وہ اس اپیل پر حیران تھے کہ کیا کریں۔ مگر میں حیران نہیں مطمئن تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مہاجرین کے خیموں کا کیا مطلب ہے اور غربت یہاں کیسے راج کرتی ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر بڑے جوش سے اعلان کیا؛ یہ ہے میرے ہفتے کا سارا جیب خرچ ۵ پیاسٹر، میرا یہ کہنا تھا کہ سارے بچوں نے اپنا جیب خرچ نکالا اور ہم خوشی کے آنسوؤں میں نہاتے ہوئے حسنہ کے لیے ایک نیا لباس خرید لائے۔

مجھے اپنے استاد نبیل سے بڑی عقیدت تھی۔ مجھے ان کی ہمتِ مردانہ اور اخلاقی طور پر مضبوط کردار، قابلِ رشک لگتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتے تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۳ء کو جبکہ اسرائیل کے قائم ہونے کی پانچویں سالگرہ تھی۔ ہم نے غم و غصے کے اظہار کے لیے جو جلوس نکالا، اس کی قیادت میں اور استاد نبیل کر رہے تھے۔

جلوس کے نعرے تھے۔ عرب فلسطین زندہ باد۔ فلسطین ہمارا ہے۔ ہم فلسطین واپس جائیں گے۔

ہزاروں بوڑھے، جوان بچے فلسطینی جمع ہوگئے اور شہر کے وسط میں استاد نبیل کی پرچم کے سامنے قسم کو دہرا کر سب نے فلسطین کو آزاد کرانے کا عہد کیا۔ استاد نبیل کہہ رہے تھے۔ ہمارے آبا سے فلسطین کی سرزمین چھینی گئی تھی۔ مگر ہم اور آنے والی نسل فلسطین کو آزاد کرا کر ہی دم لیں گے۔ تقریر کے بعد نبیل نے سب لوگوں کو سامنے جنوب کی سمت منہ کر کے عہد کرنے اور فلسطین واپس لوٹنے کا عزم کرنے کو کہا۔ کہ اس سمت وہ سرزمین تھی جسے آزاد کرانا تھا۔ مجھے انقلاب کا ذائقہ معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی بلّی سارا سے بھی انقلاب کا سبق سیکھا تھا کہ وہ بھی میری طرح کالی تھی اور ہم دونوں برابر ساتھ رہتے تھے۔ میں اپنے سبق پڑھ کر اس کو سناتی تھی۔ اس کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے سیر کو جاتی تھی۔ میں اس کے لیے کپڑے اور بستر بناتی، اس کو نہلاتی اور اس کے بالوں میں ننھے بچے کی طرح آرام سے برش پھیرتی۔ سارا میرا بچہ تھی۔ جب اس نے بچے دیئے تو میں نے دائی کی طرح کام کیا۔ مجھے اس کے بچے بھی اچھے لگتے تھے۔ جب ان بچوں میں سے ایک مرا تو میں نے اس کا باقاعدہ جنازہ تیار کیا۔ دفن کیا اور ہر روز میں اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک چوزہ میری بلی کے بچے کی قبر پر اُگے پھول نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ میں اپنے بچپنے کے غصے میں اُسے پکڑ کر گردن سے مروڑ دیا۔ سارے گھر میں بڑا ہنگامہ ہوا اور آخر کو ہمسائے کو بتایا گیا کہ ان کے چوزے نے میری عملداری میں مداخلت کی ہے۔ اب اماں نے ضد کی کہ بلی کے بچے یا تو کسی کو دے دیئے جائیں یا پھینک دیئے جائیں .... میں بڑے عذاب میں تھی۔ اماں کا کہا بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ آخر کو میں نے ایسے گھر تلاش کر لیے کہ جو ان بچوں کو

پیار سے رکھتے اور یوں یہ جھگڑا ابھی ختم ہوا۔

مگر ابھی معاملہ ختم کہاں ہوا۔ میری بلّی پھر حاملہ ہوگئی۔ اماں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گھر کو زچہ بچہ مرکز میں تبدیل ہونے نہیں دیں گی۔ اماں نے مجھ سے چھپ کر بلی کو بوری میں بند کیا اور ماموں کو کہا کہ شہر سے دور چھوڑ آئیں۔ مجھے پتہ چلا تو بہت روئی، چیخی چلائی، مگر ایک نہ چلی اور اگلے سال تک میرے پاس کوئی بلّی نہ تھی۔

۱۹۵۴ء کے موسم سرما میں، میں دس سال کی ہوگئی۔ سکول سے گھر آتے ہوئے مجھے اپنی بلی سارا دکھائی دی۔ وہ ایک ملبہ شدہ عمارت پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ میں نے جیسے ہی سارا کو دیکھا۔ میرا تو دم تو رک گیا۔ میں اس کی طرف بھاگی۔ مگر پوری طرح یقین نہ تھا کہ وہ سارا ہی ہے۔ مگر نہیں۔ وہ تو سارا ہی تھی۔ ہم بچھڑے ہوئے خوب ملے۔ خوب پیار کیا۔ سارا گھر سارا کو دیکھ کر کھل اُٹھا۔ ہر ایک نے سارا کو گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ ہفتے کے دن استاد نے کہا کہ ایک مضمون کسی ایسے واقعہ پر لکھو جو تمہاری اپنی زندگی میں رونما ہوا ہو۔ میں نے سارا قصہ لکھا اور آخر میں کہا کہ جیسے سارا پھر اپنے گھر پلٹ آئی، ہم لوگ بھی ایک دن فلسطین کی سرزمین پر واپس چلے جائیں گے۔ میرے استاد نے کہ جو خود بھی فلسطینی تھے، میرے اندر فلسطین کو واپس لینے کے لیے معجزانہ رویّے کی جگہ سائنسی رویّے کی تلقین کی۔ مگر یہ بات ابھی میرے شعور کا حصہ نہ بن سکی۔

---

(۳)

انقلاب کے شعلے کو سرد کرنے کے لیے عرب کے کالے سونے پر اپنے دانت تیز کرنے اور اپنے دفاعی معاملات کو بہتر کرنے کے لیے، اسرائیل کے خالق، روحِ رواں اور محافظ' امریکہ نے ۱۹۵۰ء کے اوائل ہی میں' اس علاقے میں نیٹو کی فوجی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ڈلز نے مارچ ۱۹۵۳ء میں مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کیا۔ امریکہ خود میکارتھزم کا شکار تھا۔ ڈلز کا منصوبہ یہ تھا کہ ہمیں کمیونسٹوں سے بچانے کے لیے' آزاد دنیا کے آزاد باشندے، ساری دنیا سے کہلوا سکے۔ اس لیے ایک طرف نیٹو کی سرگرمیاں تھیں اور دوسری طرف عرب' اسرائیل تنازعہ کو ختم کرانے کی اس طرح کوشش کہ مغربی سامراجی تسلط پورے علاقے میں برقرار رہے۔

ڈلز کی اسی کوشش کا جواب ہماری نسل کی جانب سے نفی کی شکل میں تھا۔ تمام طبقے اس بات پر آمادہ تھے کہ ڈلز منصوبے کو ناکام کیا جائے۔ بیروت یونیورسٹی کو مرکز بنایا گیا۔ عرب یوتھ موومنٹ کے نام سے جدوجہد آزادی کا آغاز نوجوانوں نے کیا۔ یہ نوجوان مسلح فوجیوں کی تنظیمی قطار توڑ کر آگے بڑھے اور سامراجیت مردہ باد کے نعرے لگاتے، ڈلز کی جانب بڑھنے لگے۔ اب تو ہر قسم کی قوت حرکت میں آ گئی۔

درجنوں طلباء کو پکڑ لیا گیا اور سینکڑوں طلباء کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچل دیا گیا۔ میرا بھائی محمد بھی مظاہرہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ واپس گھر آیا تو مظاہرے کا پورا احوال سنایا۔

سارے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ہمارے اپنے سپاہیوں نے اپنے جوانوں کو روند ڈالا تھا۔ جلتی پر تیل کا کام، بیروت یونیورسٹی میں حسن ابو اسمٰعیل کے قتل کی شکل میں ہوا۔ اب لوگوں کو امریکی اشتراک اور بغداد پیکٹ کا مطلب سمجھ میں آیا۔ یہ تو ہم لوگوں کو مزید اسیر کرنے کے لیے بغداد پیکٹ کی صورت میں کمڑی کا جال ہمارے اوپر تان رہے تھے۔ حسن کا قتل تو اور بھی بھیانہ تھا کہ اوّل قتل بیروت یونیورسٹی کے سامنے ہوا، دوسرے یہ کہ بیروت یونیورسٹی کی انتظامیہ نے صرف احتجاج بھی رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا۔ اب لوگوں پر مغربی جمہوری اداروں کی اصلیت اور ان کی سیاسی غاثت بھی واضح ہونی شروع ہو گئی تھی۔

پچاسویں دہائی کا یہ ڈرامہ اپنے عروج پر تو سوئیز کی جنگ یعنی ۱۹۵۶ء میں جا کر پہنچا۔ برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کی مدد سے مصر پر حملہ اس لیے کیا کہ ناصر کو معزول کر کے، عربوں پر ایک بظاہر امن منصوبہ تھوپ دیا جائے۔

۲۵ مئی ۱۹۵۰ء کا وہ اعلامیہ کہ جس میں تین بڑی طاقتوں برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاسی اور علاقائی سلامتی کی ضمانت دی تھی اور یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اگر کسی پر کوئی آفت، حملہ یا مصیبت آئی تو اس کی مدد بھی کی جائے گی۔ اس اعلامیہ کی صریحاً خلاف ورزی تو دو بڑی طاقتیں، برطانیہ اور فرانس براہ راست اور امریکہ بحوالہ اسرائیل کر رہے تھے۔

ان دو عملیوں کی وجہ سے سارے عرب ممالک، امریکی مرغی کے پروں تلے چھپنے والے چوزے نہ بن سکے۔ بلکہ واضح تفریق ہونے لگی۔ ناصر کی جانب جھکاؤ

رکھنے والے قومی خود مختاری اور نیشنلسٹ اور نوری کے بغداد کی سمت جھکاؤ رکھنے والے، انقلاب دشمن قرار دیئے جانے لگے۔

ہم سب کے سب ڈلز، ایک، میکملن، بن گوریون اور موشے دلیان کے شکر گزار ہیں کہ ان کی سازشوں کے باعث ہی ہم سیاسی طور پر بیدار ہوسکے ان کی دوغلی اور دورخی پالیسیوں نے ہمیں سماجی بنیاد تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ اب عربوں کو اپنے اندر کے دشمنوں اور دوستوں میں امتیاز کرنے کا ہنر اور اپنے باہر کے دشمنوں اور دوستوں سے سلوک روا رکھنے کا سلیقہ بھی آگیا تھا۔

تعلیم اور انقلاب

۱۔

"آدمی آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر ہر طرف وہ قید میں ہے"

(روسو)

عرب نیشنلسٹ موومنٹ کے ممبر کی حیثیت سے مجھے ماضی، حال اور مستقبل سے آگاہ رہنے کی تربیت دی گئی۔ غیر ترقی یافتہ معاشرے اور عوام عمومی طور پر حال اور مستقبل کا شعور نہیں رکھتے ہیں۔ مگر ایسے شعور کی ضرورت لابدی ہو جاتی ہے۔ مگر ہمیں اپنے ماحول اور اپنی زندگیوں کو مرتب کرنے کی قدرت حاصل کرنی ہوتی ہے۔ ہم ماضی پر حاوی نہیں آ سکتے ہیں اور اس کی رنگینی اور لاغر نظریاتی آلائشوں سے نجات نہیں حاصل کر سکتے ہیں، جب تک کہ آزادانہ شعور ہمارا رہبر نہ ہو۔ غیر ترقی یافتہ لوگ تو قسمت پر اعتبار کر کے اور قسمت کا کھا کے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ نوسٹیلجیا کے ساتھ ماضی کو سنہرا ماضی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

میری قوم اور میں خود بھی ان ہی آلائشوں کا شکار ہیں۔ مگر ہم تاریخ کے اس چکر کا حصہ بھی ہیں کہ جو ہماری ہمت یا فروگزاشت پر ہمارے مستقبل کا چکر بن سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ مردہ ماضی سے رشتہ استوار کرنے کی بجائے ہم اپنے مستقبل کے تعینات کے بارے میں سوچیں۔

سامراجیوں اور یہودیوں کے فلسطین کو تسخیر کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے

کہ ہم نئے سرے سے اپنی اور اپنے معاشرے کی بنیاد کی تطہیر کریں اور جائزہ لیں۔ ہم نے جب جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ ہمارا معاشرہ تو روائتی، بوسیدہ اور غیر ترقی پسند تھا ہماری شکست ہی ہماری رستگاری تھا کہ جو ہمیں اپنے بارے میں غلطیوں اور خامیوں کا اندازہ کرنے اور خود کو نئے سوشلسٹ جمہوریہ کے قیام کے لیے عملی اقدامات کرنے پر آمادہ کر رہی تھی۔

ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے یا پسپا ہونا ہے۔ اگر ہم چیلنج کو تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں پہاڑوں، کسانوں کے جھونپڑوں اور شہر کی گندی بستیوں کی جانب سفر کرنا ہوگا۔ اگر ہمیں چیلنج قبول کرنے سے انکار ہے تو ہم یہودیت سامراجیت کی پناہ میں بظاہر بڑی خوش زندگی گزار سکتے ہیں اور اپنی خوشحالی کے اعداد و شمار گزشتہ سالوں سے مقابلہ کر کے موشے دایان کے دور میں بہت بہتر ہو جانے کی نوید دنیا کو سنا سکتے ہیں ہم اپنے آپ کو تسلی دینے کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اب امن اور سکون میں ہیں اور موشے دایان کے بلڈوزروں کے قانون میں، حسین اور لبو دین رجمنٹ کے مقابلے میں زیادہ جمہوریت اور آسانی ہے۔

۱۹۵۵ء تک، میں موجود مسائل اور مستقبل کے منصوبوں سے کافی حد تک آگاہ ہو چکی تھی۔ موسم بہار میں مجھے ابتدائی سکول سرٹیفکیٹ مل گیا اور اب میرا ارادہ سیکنڈری سکول جانے کا تھا۔ میں گیارہ سال کی تھی اور اسرائیل کی عمر ۷ سال تھی۔ ہم نے اسرائیل کی پیدائش کی ساتویں برسی بھی اسی طرح سامراجیت، یہودیت اور عرب رجعت پسندی کے خلاف نعرے لگاتے اور اپنی جلاوطنی پر ماتم کرتے ہوئے گزاری۔

اس دوران اسرائیل نے ان سات سالوں کو اندرونی استحکام کے لیے اور افرو ایشائی آبادی کو یہودیت کے ساتھ ہم آمیز کرنے میں گزارے۔ ۱۹۵۴ء میں موشے شیریٹ نے امن کے بلند بانگ دعوے کئے، مگر یہودی قزاقوں نے

حکومت کا تختہ الٹا اور بن گیوریون کو برسرِ اقتدار لے آیا۔ البتہ شیریٹ کی معزولیت سے پہلے یہودی حکومت ڈپلومیسی کی تاریخ میں ایک بہت ہی خوفناک منصوبے پر عملدرآمد کر رہی تھی۔ اس منصوبے کا نام تھا "لیون افیئر" اور مقصد یہ تھا کہ مصر میں واقع امریکی اور برطانوی سفارتخانوں اور مغربی دفاعی مفادات کو بم رکھ کر اڑا دیا جائے کہ مصر کی حکومت کے غیر مستحکم ہونے کا اعتبار آئے، تاکہ اسرائیل کو تحفظ دینے والے اس طرح ڈٹے رہیں اور سوڈان سے اپنی فوجیں واپس نہ بلائیں اسرائیلیوں کا خیال تھا کہ وہ اس منصوبے کا ملبہ مصریوں ہی پر ڈلوا دیں گے۔ ان کی یہ بدقسمتی کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ منصوبہ منکشف ہوا اور "لیون افیئر" نے اسرائیلی سیاست کو اگلے دس سالوں تک کے لیے ہلا دیا۔

اسرائیل کی توسیع پسندی کا آغاز تو ۱۹۴۹ء کے روڈز معاہدے کے تحت غیر فوجی علاقوں کی سمت، اپنے ہاتھ بلے کرنے اور اسرائیل سے عربوں کے مسلسل انخلا سے ظاہر تھا۔ علاوہ ازیں عرب جو اسرائیل میں رہ گئے تھے۔ ان کو دبا کر بھی ایسی توسیع پسندی کے نئے زاویے تلاش کئے جا رہے تھے۔ ایک اور اہم واقعہ، بھاری تعداد میں عربوں کو نکالنے کا تھا۔ اس کا آغاز ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوا کہ اس دن موضع کبیا پر حملہ کیا گیا اور ۲۸ فروری ۱۹۵۵ء کو ختم ہوا جبکہ اسرائیلیوں نے غزا کی پٹی پر حملہ کیا۔ مصریوں کی بنائی ہوئی ساری حدبندیاں توڑ ڈالیں اور ڈیڑھ سو سے زائد افراد کو مار ڈالا یا زخمی کر دیا۔ اس حملے کا اثر توقع کے مطابق نہیں ہوا۔ ناصر نے اپنی فوجیں پیچھے نہیں ہٹائیں بلکہ اس نے ساری عرب دنیا کو یکجا کر لیا۔ ۱۹۵۵ء کے موسمِ خزاں میں ناصر نے مشہور زمانہ اسلحہ حاصل کرنے کا معاہدہ، چیکوسلواکیا کے ساتھ کیا۔ یوں مغرب کی اس حاکمانہ انفرادیت کو توڑا کہ صرف مغرب ہی مشرقِ وسطیٰ کو اسلحہ فراہم کر سکتا ہے اور یوں پین عربزم کی تحریک کا آغاز ہوا۔

ان واقعات کو سمجھنے میں سکول جانے کی عمر کا مشکل ہی سے کوئی بچہ تھا۔ جسے دقّت پیش آئی ہو۔ میں نے ان سارے واقعات کو نقشِ مغرب کرنے والے اسباب کے ساتھ حفظ کر رکھا تھا۔ میرے گھر کی اقتصادی حالت اور گھر کی عمومی حالت بھی اب پہلے سے بہتر تھی۔ اب ہمارے پاس تین کمروں کا اپارٹمنٹ تھا اور بھوک بھی ہمارے لیے خطرہ نہیں رہی تھی۔ سبب یہ تھا کہ میری دو بہنیں کام کر رہی تھیں اور اماں نے بھی دانشمندانہ طریقے پر کسی بزنس میں پیسے لگائے ہوئے تھے۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ عرب فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے کچھ ضرورت سے زیادہ سرگرمی دکھا رہے ہیں مگر ہم بڑی دلجمعی سے نیشنلسٹ تحریک کے ساتھ تھے۔

جدید عرب کی تاریخ میں ۱۹۵۶ء ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ناصر کی حکومت اندرونی اور بیرونی عناصر کی امداد سے برطانوی حکام سے انخلا کا معاہدہ ۱۹۵۴ء اور جون ۱۹۵۰ء میں مکمل انخلا کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب ڈلز اور ایڈن نے ناصر کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سوچی کیونکہ ناصر مغربی اشاروں کی بجائے غیر جانبدار متوازن پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ ان لوگوں نے اس پر اقتصادی پابندیاں لگیں۔ وہ ہراساں نہیں ہوا۔ ناصر کو اب اپنی خفیہ قوت اور عربوں سے روابط کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایڈن اور ڈلز اس بنیادی تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ناصر کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، تو یوں ناصر برافروختہ ہوگا۔ پھر اسوان ڈیم کے لیے منظور شدہ .. کروڑ پونڈ کے قرضے کو دینے میں لیت ولعل کر کے اس کو مزید ہراساں کیا جا سکے گا۔

مگر ناصر نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۵ء کو نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے کر عرب جن کے کا جاگنے کا اعلان کیا۔ مغرب کی سمت یہ پہلی کف آلود نظر تھی۔ عوام کی بھرپور حمایت اور ناصرازم تو دنیا بھر کے لیے ناقابلِ تقلید مثال بن گیا۔ مغرب تو اس بات پر اور بھی ہراساں ہوا جب اس نے دیکھا کہ عرب پائلٹ، مغربی ہمعصروں سے کہیں بہتر

طریقے پر نہر کا انتظام چلا سکتے ہیں۔

دنیا نے ٹھہر کر اور آنکھیں کھول کر یہ سب کچھ ہوتے دیکھا۔ تیسری دنیا کے ملکوں نے قاہرہ اپنے نمائندے بھیج کر، حمایت اور تعاون کا یقین دلایا۔ جب آسٹریلوی وزیر اعظم نہروں کو استعمال کرنے والوں کی انجمن کے صدر کی حیثیت سے الٹی میٹم ذاتی طور پر دینے کے لیے قاہرہ پہنچا تو ناصر نے اُسے نہ صرف صاف انکار میں جواب دیا بلکہ ملک سے واپس بھیج دیا۔ عرب دنیا نے ناصر کے اس قدم کو بھی عزت و احترام کے ساتھ لیا۔ یورپ اور امریکہ غصے سے بے قابو تھے۔ مگر تیسری دنیا کا عظیم رہنما ناصر بنا ہوا تھا۔ پھر مصر پر وہ نابکار حملہ کیا گیا جسے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر ناصر نے اب بھی طاقت اور نہر سویز کو اپنے قابو میں رکھا۔ جبکہ اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ یہ سازش کی تھی کہ ناصر کا تختہ یوں الٹنے کے بعد عربوں کی قسمت پھر گردش ہی آئے گی اور ہماری دنیا پر پھر سامراجی سازشوں کا جال حکمرانی کرے گا۔

یہ موسم خزاں، میرے بچپن کا سب سے زیادہ یاد رکھنے والا زمانہ تھا۔ ہم تمام لوگ پہلی دفعہ فخر اور اعتماد کی روح سے آشنا ہوئے تھے۔

۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک کے سال، میری سیاسی تربیت کی مدت قرار پاتے ہیں۔ میری بڑی بہن ذفیہ اور رباب پہلے ہی ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں عرب نیشنلسٹ مومنٹ کی رکن بن چکی تھیں۔ میں، ۱۹۵۷ء میں مومنٹ سے منسلک ہوتی۔ مجھے اب تک یہی معلوم تھا، مومنٹ کا رکن ہونے کا مطلب ہے کہ تھوڑی بہت تقریر کر لو ضرورت ہو تو مظاہرے میں شریک ہو جاؤ۔ پمفلٹ لکھو اور تقسیم کرو۔ یہ تو مجھے شامل ہو کر پتہ چلا کہ مومنٹ تو بہت آگے کی بات ہے۔

۱۹۵۷ء میں مومنٹ تیز ہونے کا سبب یہ تھا کہ افواہ یہ گرم تھی کہ ترک، شام پر حملہ کر کے شام کی ترقی پسند حکومت کا تختہ الٹ کر امریکہ کا عمل دخل تیز کرنا

چاہتا ہے۔ میں چونکہ ابھی ابتدائی کلاس میں تھی، میں نے اپنی بہنوں کو معلومات دینے کے لیے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ میں ابھی مومنٹ کی باقاعدہ ممبر نہیں ہوئی تھی۔

البتہ ۱۹۵۸ء میں لبنانی فوج کی جانب سے آرٹلری فائر کے باعث ممبر اور نامبر ول کی تخصیص ختم کر دی گئی۔ سور کا محاصرہ کر لیا گیا۔ فلسطینیوں اور عربزم کے چھوٹے دوستوں نے آنکھیں دکھانی شروع کر دیں کہ اس وقت یو۔ اے۔ آر۔ وجود میں آچکا تھا۔ اپنی گرتی ہوئی قوت کو سنبھالا دینے کے لیے عراق اور اردن کے دشمنوں نے متوازی کنفیڈریشن مغربی اشارے پر بنائی۔ سارے عربوں میں پھوٹ ڈال دی گئی۔ بین عربزم متقابل علاقائی سلامتی، انقلاب، متقابل نفی انقلاب، قاہرہ بمقابل بغداد وغیرہ قسم کے نعرے بلند کئے گئے۔ اس سیاسی سرگرمی کے زمانے میں لبنانی صدر چمون نے مغربی طاقتوں کا لاڈلا ہونے کے باعث، دوسری مرتبہ صدر بننے کے لیے انتخابات کا ڈول ڈالا۔ عرب نیشنلسٹ مومنٹ اور دوسری طاقتوں نے چاہے وہ ترقی پسند تھیں کہ رجعت پسند، ان سب نے چمون کی مجوزہ آئینی تبدیلی کو ہر طرح سے روکنے کی کوشش کی۔ اندرونی خلفشار بڑھا۔ نصیب المتنیٰ، عرب سیاسی ایڈیٹر کے قتل کے بعد، سول وار اور بھی تیز ہو گئی۔

ہر چند میں نے سور میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک مظاہروں میں مسلسل حصہ لیا تھا لیکن میں نے سوائے حیفا میں اپنے گھر کے سامنے قتل ہوتے آدمی کے اور کوئی ایسا سفاکانہ عمل نہیں دیکھا تھا۔ مان حلاوا کو اس وقت مرتے دیکھا جب اس کے باغی ساتھیوں نے اُسے کندھوں پر اٹھائے رکھا تھا اور وہ زوردار نعرے لگا رہا تھا۔ محمد کاسم کو اس وقت مارا گیا جبکہ انتظامیہ نے سور پر بھی کرفیو نافذ کرنا چاہا اور اس نے خلاف ورزی کی۔ جبکہ میں تو محمد قاسم کو پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے کو دے رہی تھی۔ جب قاسم پر حملہ کیا گیا

تو میں چیختی چلاتی اور مدد کیلئے شور مچاتی بھاگی۔ اس کے چاک پیٹ کو سمیٹ کر ٹوٹی ہوئی کار میں رکھا گیا اور آپریشن تھیٹر سے باہر ڈاکٹر آنسو پونچھتا ہوا نکلا۔

مجھے زندگی میں پہلی بار — ایک کامریڈ کے یوں بچھڑنے کا غم ہوا۔ میں کتنے دن تک روتی رہی۔ سارے شہر میں ان دونوں کامریڈوں کے جنازے سسکیوں اور آہوں کے درمیان اٹھائے گئے۔ مگر یہ تو ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ ایک صبح چھیون کی فوجیں امریکی ہتھیاروں کا اشتہار بنی ہمارے شہر کو تسخیر کرتی آگے بڑھیں۔ پوری گھڑیوں میں مجھے کوئی رات ایسی یاد نہیں کہ جب آرام کی نیند ممکن ہو سکی ہو۔

میں تیرہ سالہ مجاہدہ تھی اور میری خواہش تھی کہ میں ایک اچھے سپاہی کی طرح یاد کی جاؤں۔ لبنانیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ غیر ملکی سازشیوں کے ہاتھوں، ملکی باشندے کھلونا بنے ہوئے تھے۔ ۱۶ جون ۱۹۵۸ء کو امریکی میرینز لبنان میں اتریں اور اس کے صرف ۲ دن بعد عراق کے لوگوں نے ہاشمی خاندان کو معزول۔ نور السعید اور عبداللہ (دونوں برطانیہ کے زرخرید ایجنٹوں کی طرح تھے) کو سزا دے دی۔ لبنانی عرب باشندوں نے چھٹے بحری بیڑے کا غضبناک اختتام دیکھا۔ امریکہ کے لیے نوری اور ان کے حواریوں کو پھر حکومت فراہم کرنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔ مگر یہ لوگ لبنان ہی میں رہے۔ سول دار میں تعطل پیدا کیا اور اسے نامختتم قرار دیا۔ عرب سیاسی مبصروں نے اسے "نہ شکست نہ فتح" کا عنوان دیا۔

۱۹۵۸ء کا موسم گرما تو پھر بھی پرسکون رہا، مگر بعد میں کہیں بمباری زور پکڑ جاتی تو کہیں ہماری خوراک کی سپلائی میں تعطل آ جاتا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دونوں امتحان اکٹھے آ گئے۔ ایک طرف خوراک کی سپلائی بند ہوئے کافی دن ہو گئے۔ دوسری طرف بمباری دم نہیں لینے دیتی تھی۔ بھوک کے مارے لوگوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ ہمارے گھر میں کوئی دس کلو آٹا تھا۔ میں نے اس سارے آٹے کی روٹیاں بنانے کا فیصلہ کیا۔

پھر میں نے روٹی کی جگہ سارا آٹا زیتون کے تیل میں بھون کر حلوہ سا بنا کر اس کی روٹی بنائی اور تقسیم کرتے وقت حضرت عیسیٰ کے وہ معجزے یاد آئے کہ جتنی خرچ کرتے جاتے تھے چیز اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔

تقسیم کرتے ہوئے مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ میں دشمن کے کیمپ سے ہوں۔ زن زن گولیاں چل رہی تھیں اور مجھے روٹیاں بھوکے مجاہدین میں تقسیم کرنی تھیں۔ میں نے چیخ کر کہا "ذرا گولیاں بند کرو۔" میرے سر پر روٹیوں کا تھال ہے ان میں سے ایک کامریڈ نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے فی الوقت حملہ کرنے سے منع کیا۔ میں بھاگی سیدھی اس کے پاس گئی۔ کھانے کو روٹی دی اور یوں جنگ کا اور منظر نامہ میرے ذہن میں دائم ہو گیا۔

پھر ایک اور سبق جو میں نے اس جنگ سے سیکھا۔ جب کوئی لبنانی سپاہی میرے پاس پانی مانگنے آتا، تو میں کہتی کہ "میں پانی کی جگہ تمہیں زہر دوں گی"۔ وہ پوچھتا "تم مجھے زہر کیوں دو گی"۔ تو میں کہتی کہ "تم ہمارے آدمیوں کا قتلِ عام کر رہے ہو"۔ وہ ہنس کر کہتا "ہمیں حکم ہے گولی چلاؤ۔ ہم گولی چلا رہے ہیں۔ مگر ہم کسی کو نشانہ نہیں بنا رہے ہیں۔ ہم تو تمہارے لوگوں کو اپنے اپنے مقام تک محدود رکھنے کو گولی چلاتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہ آگے بڑھنے سے گریز کریں۔ ورنہ ہم ان کا صفایا کرنے پر مجبور ہوں گے"۔

میں نے اس کی گفتگو سن کر تھوکتے ہوئے کہا "یہ سب بکواس ہے۔ وہ جو کچھ بک رہا ہے۔ اس کے عوض اسے پانی کا گھونٹ بھی نہیں ملے گا۔ مگر اماں نے اس کی بات کو سچ سمجھتے ہوئے اُسے پانی دیا۔ میں نے کہا "اماں ہمیں اس کو جنگی قیدی بنا لینا چاہیئے"۔ اس نے یہ سن کر بندوق کی نلکی کا رخ میری سمت کرتے ہوئے کہا: "اگر ہمت ہے تو اس کی سمت والے شہر کے حصے پر میں حملہ کر کے دکھاؤں"۔ ماں نے اس کو سمجھاتے

ہوئے کہاکہ وہ اور اس کے ساتھی یوں وحشیانہ گولیاں نہ چلائیں اور اس نے بھی ماں کو یقین دلایاکہ لبنان اس کی سرزمین ہے وہ بھی اُسے تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔

۱۹۵۸ء کی جنگ میں خدمات سرانجام دے کر، میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ میں اب عرب نیشنلسٹ موومنٹ کے رکن کی حیثیت سے شامل ہو سکتی ہوں۔ میری ماں کو سخت اعتراض تھا کہ خاندان کی لڑکیاں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ سول وار ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے لڑکیوں کو سیاست صرف مردوں کے لیے چھوڑ دینی چاہیئے۔ یعنی ان کے خیال میں محمد، آدمی تھا۔ تو اس کو حصہ لینا زیب دیتا تھا۔ ماں کا خیال تھا کہ اگر ہم میں سے کسی نے سماجی قیود کو توڑا تو قیامت آجائے گی کہ وہ سیاست میں آنے والی لڑکیوں کے محلے والیوں سے سیکنڈل نہیں سن سکیں گی میری بہنوں نے ماں کو یقین دلایاکہ وہ بالغ ہیں اور اپنا دفاع خود کرنا جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہاکہ اس نصب العین سے وابستہ لوگ، لڑکیوں اور خاص کر کامریڈ لڑکیوں کو کچھ نہیں کہتے بلکہ خاص خیال رکھتے ہیں۔

آخر کو ابا اور محمد کی وکالت ہمارے کام آئی اور یوں میری بہنوں کا سیاسی کام جاری رہا۔ فلسطینی مہاجرین میں بھی پچاس فیصد عورتیں تھیں۔ اسرائیلیوں نے اپنی تمام عورتوں کی جنگی بنیادوں پر تربیت کی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ فلسطینی خواتین بھی جنگی تربیت سے بہرہ ور ہوں۔ ماں کے مسلسل اشتعال کو دیکھ کر ابا نے آخر ایک دن پوچھا: "آپ فلسطین کو آزاد دیکھنا چاہتی ہیں"؟ "ہاں ہاں کیوں نہیں"۔ اماں نے بے دھڑک جواب دیا۔ اب محمد کی باری تھی۔ بولا: "پھر تو آپ سیاست میں اپنی بیٹیوں کے حصہ لینے پر اعتراض کر ہی نہیں سکتی ہیں"۔ "میں ذفیہ اور رباب کے حصہ لینے پر معترض نہیں ہوں مگر یہ فتنہ ذراسی بچی (میری طرف اشارہ کر کے کہا) اس کو تو گھر رہنا چاہیئے۔

میں اس سودے بازی میں قربانی کا بکرا بنی اور آخر یہ زنجیر ٹوٹی، لڑکیاں سیاست

میں حصہ لینے لگیں چونکہ میری بہنیں حصہ لے رہی تھیں۔ اس لیے میرا جلدی یا بدیر، سیاست میں حصہ لینا بعید از قیاس بات نہ تھی۔

۱۹۵۹ء میں جبکہ میں عرب نیشنلسٹ موومنٹ کی باقاعدہ ممبر ہو گئی تو بھی اماں نے میرے میٹنگوں میں جانے پر اعتراض کیا۔ میں اماں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہاکہ میں تو صرف موومنٹ کے معاون کی حیثیت سے جاتی ہوں۔ ممبر تو میں ہوں ہی نہیں۔ مگر اماں کو اعتبار نہ آیا۔

ایک رات بہت اہم میٹنگ تھی مجھے جانا ضروری تھا۔ مگر میں نے اماں کو یقین دلانے کو کہ میں کہیں نہیں جا رہی ہو۔ میں نہائی، رات کا پاجامہ پہنا اور لیٹ رہی۔ آدھی رات کے قریب، بارہ بجنے میں چند منٹ پہلے میں نے کہا" اماں میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ نیند بھی نہیں آرہی ہے۔ میں ساتھ والی سہیلی کے پاس جا رہی ہوں"۔ اماں نے بے دھڑک اجازت دے دی اور میں بلسے بلسے ڈگ بھرتی ہوئی سولیڈیٹری کلب پہنچ چکی تھی۔

سب لوگ مجھے پاجامے میں دیکھ کر حیران ہوئے اور اسے میری بداخلاقی اور بدتمیزی جانا اور مجھے اخلاقی حدود متجاوز کرنے پر بہت ڈانٹا گیا۔ کچھ رجعت پسندوں نے تو میرے پاجامے کو دعوتِ جنس تک سے تعبیر کیا اور کچھ نے روایت کو مسمار کرنے کی مذموم کوشش کہا۔ میں میٹنگ کے دوران بڑے غصے میں رہی کہ میری گھریلو مجبوریاں نہ سمجھتے ہوئے لوگوں نے اپنی مردانگی کو ظاہر کرنے کی ہر کمینی سے کمینی حرکت بھی کی۔ میں نے سوچا کہ ہم لوگ ابھی خود ذہنی طور پر آزاد نہیں تو ہم فلسطین اور عرب سرزمین کو کیسے آزاد کرا سکیں گے؟

اماں کو میری اس چوری کا علم نہیں ہوا۔ مگر جلد ہی انہوں نے مجھے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ میں کوئی دس سال تک عرب نیشنلسٹ موومنٹ میں حصہ لینے کے بعد، عورتوں کے لیے کام کرنے اور آگے بڑھنے کا ماحول بنا سکی۔

سیکنڈری سکول کی تعلیم کے لیے میں نے سائمرہ سکول برائے طالبات میں داخلہ لیا۔ مجھے نئی نئی آزادی کی سرمستی بھی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات گرہ بڑھتی کہ سکول میں کم ازکم دو سال تک رہائش رکھتے ہوئے امتحان دو، تب جاکر گریجویشن کی سند ملے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے دو سال سیاسی سرگرمیوں سے گریز کرنا پڑے گا۔ مگر تعلیم کو سیاسی بصیرت کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے میں نے خود سے عقلی سمجھوتہ کرلیا۔

۱۹۶۰ء موسمِ خزاں، اقوام متحدہ میں بین الاقوامی سمٹ کا سال تھا کہ اس سال بڑی طاقتوں کی رسہ کشی اور باہمی مزاحمت کم تھی۔ صدر ناصر اقوام متحدہ گئے ۱۹۵۶ء کے مقابلے میں اب وہ مضمحل اور نرم گو معلوم ہورہے تھے۔ انقلاب پر ڈپلومیسی حاوی آچکی تھی۔ تیسری دنیا کا اُبال اب بیٹھ رہا تھا۔ صرف الجزائر میں ہنگامہ اور انقلاب کی فضا تھی۔ مجھے اس نئے سیاسی اور سماجی ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنا اور کسی انقلابی مسیحا کا انتظار کرنا تھا، مگر نومبر ۱۹۶۷ء تک پاپولر فرنٹ نہیں بنا تھا۔

سائرہ سکول میں کام کم اور سوچنے کو وقت زیادہ تھا۔ اس وقت میں بھی بالکل فلسطینی سیاست میں ڈوبی ہوئی نہ تھی۔ سکول کا سارا ماحول انقلاب کا مدفن تھا۔ مجھے ۱۲ دیگر لڑکیوں کے ساتھ ہوسٹل میں جگہ ملی تھی۔ ان میں سے صرف چند فلسطینی تھیں کہ جن سے بات ہوسکتی تھی۔ مگر ان سب کے لیے فلسطین بھولے بسرے ماضی کی طرح کوئی چیز تھی۔ ان کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہیں تو بس تعلیم حاصل کرنی تھی کہ بعد میں اس درجے سے اچھا شوہر مل سکے۔ میں نے ان لڑکیوں کے ساتھ حتی الامکان رابطہ رکھنے اور گھل مل کر رہنے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔ مجھے لگتا تھا کہ میں گیارہ لڑکیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہا ہوں ـــــ یہاں ایک اور میری طرح کی تنہا لڑکی تھی مس میک نائٹ ایک امریکن سیاہ فام لڑکی جو امریکہ سے یہاں تک سائرہ پرائیویٹ سکول میں پڑھانے آئی تھی میں تو اس کے یہاں آنے پر اس وقت تک حیران رہی جب

تک کہ مجھے اس کا سبب معلوم نہیں ہوا۔ لبنان میں اس کے ساتھ بطور انسان سلوک ہوتا تھا اور عرب دنیا میں جو مرتبہ اساتذہ کو دیا جاتا ہے، وہی اُسے بھی حاصل تھا۔ جبکہ امریکہ میں سیاہ فام ہونے کے باعث اُسے کمتر شہری اور جنسی غائت کی چیز" سمجھا جاتا تھا۔

مس میک نائٹ اور میں لاشعوری طور پر دوست بن گئے۔ دو سیاہ فام عورتیں، میں اور مس نائٹ، ایک دوسرے کے آرام اور ضرورت کا خیال رکھنے لگیں مس نائٹ تھی بہت پیاری خاتون۔ ہمیشہ مسکراتی، خوش مزاج و خوش گفتار میرے لیے تو بڑی بہن کی پناہ اور نمونہ بھی وہی تھی۔ وہ حیران ہوئی۔ جب میں نے یہودیوں کے بارے میں سخت نفرت کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے کہا کہ یوں بے سوچے سمجھے اعلانات درست نہیں ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے کہا کہ یہودی صیہونیت زدہ نہیں ہوتے بلکہ اینٹی زایونسٹ بھی ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ میں نے اپنے اندر سنبھال کر رکھ لیا۔

فی الفور اعلامیے اور فلسطین کی تقسیم کی برسی کا دن نزدیک آرہا تھا میں نے سکول میں عام ہڑتال کی تجویز پیش کی ـــــ بالکل ویسے جیسے میں سور میں کیا کرتی تھی۔ مس نائٹ نے اس خیال کو پسند کیا، مگر وہ عام ہڑتال کے خلاف تھیں اور اس بات کے بھی کہ سکول میں اس دن بالکل چھٹی کردی جائے۔ پبلک ریلی کی جائے اور پولیس سٹیشن تباہ کئے جائیں۔ دراصل وہ مارٹن لوتھر کنگ کے سکول برائے غیر اشتعالی ماحول کی گریجویٹ تھیں۔ انہوں نے دشمن کو عقل دینے کی دعا کے لیے عبادت کی۔ میں ان کے متضاد متحارب انقلابی تھی۔ میں تو انقلاب کی گود میں پل کر بڑی ہوئی تھی۔

ہمارے اختلافات کے باوجود ہم آپس میں دوست رہیں کہ ہم دونوں بنیادی حقوق سے محروم تھیں۔ مس نائٹ نے عرب لبنانی پرنسپل کو ایک پرسکون

عرب ریلی کرنے اور فلسطین کی حمایت میں خاموش جلوس نکالنے کی اجازت دینے کے لیے مجبور کیا۔ ریلی، البتہ نومبر سے ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ یہ موقع تھا کہ میں نے فلسطین کے موضوع پر پہلی عوامی تقریر کی۔

---

(۲)

میں نے فلسطین صیہونیت کی تاریخ اور مستقبل کی توقعات کے بارے میں تقریر کی۔

"صیہونیت نے سیاسی ڈھانچہ، بیسویں صدی میں اختیار کیا۔ اس کے بنیادی مذہبی نظریات یہ ہیں کہ چند بوڑھے یہودیوں نے بیت المقدس کی زیارت کے لیے سفر کیا اور وہ وہیں وفات پا گئے۔

صیہونیت کا لفظ ۱۸۸۶ء میں بن اچہ، ایک یورپی یہودی نے اختراع کیا تھا وہ کبھی فلسطین نہیں آیا تھا۔ پھر ہرزل نے اپنے پمفلٹ میں صیہونیت کی سیاسی توجیہ کی تھی۔ وہ بھی یہودی تھا اور اس کا تعلق آسٹریلیا سے تھا اگرچہ وہ اپنے یہودی ہونے کے بارے میں ۱۸۸۰ء سے پہلے کوئی خاص سنجیدہ نہیں تھا۔ سیاسی مبصر کے ناطے پیرس میں ڈریفس مقدمے کے دوران وہ صیہونی ہو گیا۔ اُسے یہ غصہ تھا کہ فرانس اس قدر مہذب ملک ہونے کے باوجود ایک یہودی کو اس جرم کی سزا دینے پر تُلا ہوا تھا جو اس نے کیا ہی نہ تھا۔ اس موقع ہرزل کو احساس ہوا کہ صرف یہودی ریاست ہی میں یہودی آدمی ایک نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ اور تمام وسائل یورپین جیوزری کو متحرک کرنے میں لگا دیے اور بیسل کے مقام پر ۱۸۹۷ء میں پہلی صیہونی کانگرس منعقد کی۔ اس کا پورا منصوبہ تسلیم کر لیا گیا۔ عالمی صیہونی تنظیم قائم کر دی گئی

اور ہرزل کو اس کا چیئرمین تسلیم کر لیا گیا۔ ہرزل نے اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قیصر کی مدد چاہی۔ وہ استنبول پہنچا اور سلطان پورٹے کی مدد مانگی۔ اس نے اپنے بہی خواہوں کو بتایا کہ یہودی سرمایہ علم اور ہنر، برلن اور استنبول کے قدموں میں رکھ دیا جائے گا اگر پورٹے، یہودیوں کو جنوبی عرب، شام اور فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دے۔ مگر پورٹے نے عربوں کے غم و غصے سے ڈرتے ہوئے، یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

اب ہرزل کو نگاہِ انتخاب کسی اور سمت دوڑانی پڑی۔ اُسے برطانیہ میں وہ قوت مل جسنے مصر، سوڈان اور خلیج عرب کو سامراجی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس نے برطانیہ کے سامنے اپنے مطالبے کو دُہرایا اور منطق یہ پیش کی کہ یہودی ریاست عرب انقلاب کو روکنے کے لیے سب سے اہم کام سرانجام دے گی۔ خاص کر نہر سوئیز اور مشرقِ بعید کے تجارتی روابط محفوظ کرنے میں معاون ہوگی۔

آغاز سے ہی اسرائیل کے قیام کا مقصد عربوں کو متحد ہونے سے روکنا تھا۔ برطانیہ کو عالمی یہودی امرا کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے ارجنٹائن اور یوگنڈا کے علاقوں کو یہودیوں کی آبادکاری کے لیے تجویز کیا۔ ہرچند ہرزل کو یہودی ریاست فلسطین میں قائم کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یوگنڈا کی تجویز کو ہی فی الحال قبول کیا اور اپنے دیگر معتمدین متعلق کو عالمی صیہونی تنظیم کے سامنے پیش کیا۔ یہ ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ہرزل کا انتقال ہو گیا اور یوگنڈا پراجیکٹ بھی گویا اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

برطانیہ نے مصر میں بحیرۂ روم کے کنارے وہ علاقہ جو فلسطین کے نزدیک تھا اور العریش کے نام سے جانا جاتا تھا، یہودیوں کو پیش کیا مگر انہوں نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ ۱۹۶۷ء کے موسمِ خزاں میں اسرائیلیوں نے نہ صرف پورے فلسطین پر قبضہ کیا

بلکہ العریش، سینائے اور شام میں شامل میں شام گولان کی پہاڑیوں پر بھی اپنا تسلط حاصل کر لیا) ۱۹۱۷ء میں جب یہودیوں نے برطانیہ سے زبردستی فی الفور اعلامیے کو بنوایا۔ ہرچند یہودی اس علاقے کی آبادی کا دسواں حصہ تھے۔ مگر اعلامیہ تیار کرنے والے افراد کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ہمارے لوگوں کو غیر یہودی ظاہر کر کے اقلیت کو اکثریت میں بدل دیں۔ برطانوی طاقتور تھے اور ایسے طاقتور لوگوں کو پسند کرتے تھے جو کہ سرمایہ بھی فراہم کر سکیں۔ صیہونی کوئی بھی معاوضہ اور کوئی بھی معاہدہ اس حصول کے لیے کرنے کو تیار تھے اور ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر، اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

بڑی طاقتوں کے بنیادی تعاون سے وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے کہ برطانیہ اور فرانس نے مشرقِ عرب میں سات ریاستیں بنوا دی تھیں۔ اور عربوں پر مغربی تہذیب کے جال میں پاکیزہ ٹرسٹ بنا دیئے گئے تھے۔ پھر ان کے حواریوں نے عرب نیشنلسٹ موومنٹ کو دبایا اور انقلابی تحریک کے تمام عوامل کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی کہ جو آگے چل کر یعنی ۱۹۱۶ء میں عظیم عرب انقلاب بن کر ظاہر ہوا۔

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں دُہری قوت استعمال کرنے کی اجازت اور عربوں کو ان ہی مراعات سے انکار تھا۔ ہم نے اس دوغلے پن پر اور یہودیوں کو زیادہ مراعات دینے پر احتجاج کیا اور اپنی آزادی کے لیے ہم لڑے مگر دشمن تو ہماری صفوں میں موجود تھے اور ہمارے اپنے آئینی رہنما اس غداری کے مرتکب ہوتے تھے۔ ۱۹۳۶ء کی عام ہڑتال ایک ایسی شاندار مثال تھی کہ جس میں مزدوروں اور کسانوں نے مل کر انقلاب کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اوپر کے درجے والوں کو عام آدمیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ امرا کے طبقے نے عام آدمیوں کے ساتھ تعاون ضرور کیا۔ مگر ذاتی مفادات کے لیے

عام آدمیوں کی قربانیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب ۱۹۴۸ء کی جنگ آئی۔ حکمراں طبقوں نے ہمیں پرکاہ بھی نہ سمجھا صیہونی بنا زیادہ محنت کئے ہمارے دلوں سے فلسطین کی سرزمین بھی اٹھا کر لے گئے۔

ہمارے زمینداروں کے ذہنی بانجھ پن اور ہمارے سماجی ڈھانچے کے تباہ ہونے کے لیے راستے، سامراجی گماشتوں کی قائم کردہ حکومتوں کے ذریعہ اور بھی بڑھے۔ اسی دوران صیہونیوں نے اپنے لیے اپنی علیحدہ ایک نسل پرست معاشرہ قائم کیا۔ جس میں مشرقی یورپی صیہونی، پولش اور روسیوں نے حکومت اور تجارت میں اپنا مکمل عمل دخل رکھا۔ افرو ایشیائی یہودی یہاں بھی امتیازات کا شکار تھے اور یوروپیوں کے مقابلے میں تحقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ عرب باشندوں کو جو کہ فلسطین کے اصل حق دار تھے۔ ان کو فوجی انتظام میں رکھا گیا اور سستی مزدوری حاصل کرنے والوں میں ان کا نام عرب یہودیوں کے ساتھ ساتھ آتا تھا۔

میں نے اپنی تقریر، آزاد فلسطین کے قیام کے زور پر ختم کی۔ میں نے مزید کہا کہ یہ صورت نہ بہت دیر چلے گی اور نہ چلنے دینی چاہیے۔ ہم اسے عرب اتحاد اور فلسطین کی آزادی سے ہی ختم کر سکتے ہیں۔ ہمارے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اگر یو۔ اے۔ آر کو مزید وسعت دی جائے اور تمام عرب ریاستیں ایک قومی ریاست میں تبدیل ہو جائیں۔ ہمیں جدوجہد کرنی ہے۔ ایک عرب قوم۔ اتحاد۔ آزادی اور سوشلزم کے لیے پہلے ہمیں دشمن نمبر ایک یعنی امریکہ کو شکست دینا ہے کہ اس نے طیارہ مار میزائل اسرائیل کو فراہم کئے ہیں، ہمیں اپنے تیل کے ذخائر کو اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔ ہمیں فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے اپنے فلسطینی بھائیوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔

زندہ باد فلسطین۔ عرب اور انقلابی دوستو!

(۳)

میری تقریر سن کر طلبا میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوا۔ انہوں نے زبردست تالیاں بجائیں وہ میری فلسطین کی تاریخ کے علم کے بارے میں بھی بہت متاثر ہوئے اور عرب اتحاد کے لیے یقینِ محکم تو ان کے دل میں گھر کر گیا۔ (اس وقت نہ میرے ذہن میں یہ خیال تھا نہ ان طلباء کے کہ یو۔ اے۔ آر ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو ختم بھی ہو جائے گا کہ جب شام نے عرب اتحاد سے مایوس ہو کر اپنا علاقہ الگ کر لیا اور فلسطین کو پھر آزادی کی ناؤ پار لگانے کے لیے نئے پتوار تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ یو اے آر کی تنسیخ ہماری امیدوں کے وقتی زوال کا زمانہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی فلسطین انقلاب کی توقع نے سر اٹھایا۔ ہر جگہ فلسطینی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ مشرقی عرب میں یہ نیا سویرا تھا جبکہ مغربی عرب میں الجزائر کی مسلح جدوجہد کامیابی اور آزادی کی نوید سنا رہی تھی۔)

اس سال موسمِ بہار میں، میں نے سکول گریجو ایشن کی اور گرمیاں گزارنے میں صور واپس گئی۔ یہ بھی سوچا تھا کہ موسمِ خزاں میں امریکن یونیورسٹی بیروت میں داخلہ لے لوں گی۔ اگر انٹرنس میں پاس ہو گئی تو اس سال عرب کی قومیت اور قسمت کے فیصلوں

کے بارے میں مرکز سور بنا ہوا تھا۔ تحریک ہر چند بہت تیز نہیں تھی۔ مگر ناصر کے راکٹ اور فلیٹ بنانے کے منصوبے سے حوصلہ ہوتا تھا۔ ۲۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو ناصر نے انقلاب کی دسویں سالگرہ منائی اور اس موقع پر مصر کے بنائے ہوئے راکٹوں جہازوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی نمائش بھی کی گئی۔ اس نے دنیا کے سامنے اعلان کیا کہ مصری راکٹ بیروت کے جنوب میں پہنچیں گے۔ اس نے اور عامر نے پریڈ کی سلامی لی اور یوں نظر آرہا تھا۔ جیسے سٹالن، چرچل اور روز ویلٹ سارے مل کر ایک شخصیت یعنی ناصر میں تحلیل ہو گئے تھے۔ ہمارے حوصلے بڑھے کہ اب اسرائیل، بھلا عربوں کی گرفت سے بچ کر کہاں جائے گا۔ ناصر نے بھی اعلان کر دیا کہ مصر کی فلیٹ، بحرِ روم میں سب سے بڑی ہے اور ہمیں لگا کہ انتقام کا وقت آگیا ہے۔ ہمیں ترکی سے بھی پہلی جنگِ عظیم کے سفاکانہ قتلِ عام کا بدلہ لینے کا خیال اُکسانے لگا۔

۱۹۶۲ء کے موسم گرما میں مجھے پھر فلسطین عرب خاتون ہونے کا مسئلہ پیش آیا مغرب میں میری بہنیں دو طرح کے استحصال کی بات کرتی ہیں۔ طبقاتی اور جنسی۔ مجھے چار قسم کے استحصال کا سامنا تھا۔ قومی، سماجی، طبقاتی اور جنسی۔ میرے خاندان میں کہنے کو مساوات تھی مگر جیسا کہ سارے ترقی پسند خاندانوں میں ہوتا ہے عملی طور پر کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ ہر چند میں نے سکول گریجویشن بڑے اعلیٰ نمبروں سے کیا اور میرا بھائی خالد فیل ہو گیا۔ مگر پھر بھی خاندان، خالد کو یونیورسٹی بھیجنے پر مُصر تھا اور میرے لیے صرف ایک حرف "انکار" تھا کہ میں ایک خاتون تھی۔ آخر کو اپنے بھائی محمد کی فیاضی کے باعث میں ۶۳-۱۹۶۲ء میں امریکن یونیورسٹی بیروت میں داخلہ ملا ہو کہ محمد اس وقت کویت میں بطور انجنیئر کام کر رہا تھا۔ یونیورسٹی امتحان میں میرے ۸۷ فیصد نمبر آئے اور اب مجھے وظیفہ مل سکتا تھا۔ مگر یہاں بھی کوئی چکر چلا اور وظیفہ مجھے نہیں ملا۔

مگر میں امتحان پاس کرنے اور داخلہ ملنے کی اجازت پہ ہی خوشی تھی۔ ورنہ عام عورتوں کی طرح یا بچے پیدا کر رہی ہوتی یا شادی کی چکی میں پس رہی یا دفتری عمومی نظام کی نذر ہو گئی ہوتی۔

جب میں بیروت اگست ۱۹۶۲ء میں اتری تو میری کل پونجی ۵۰ لبنانی پونڈ تھے میں نے سوچا میں قسطوں والے خانے میں اپنا نام لکھوا دوں۔ مگر نہ پرنسپل رضامند ہوتا تھا نہ رجسٹرار۔ میں بہت یقین دہانی کراتی رہی کہ وہ مجھے رجسٹر تو کریں، اس سے پہلے کہ کوئی اور میری جگہ لے لے۔ میں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اگلے تعلیمی سال کے آغاز سے پہلے، میں سارے بقایا جات ادا کر دوں گی۔ مگر وہ رضامند نہ ہوا۔ میری گڑگڑاہٹ سن کر دفتر کی ایک لڑکی بولی "مس آپ یہ پیسے کیسے پورے کریں گی"۔ "میرا ایک بھائی کویت میں ہے، اس کے کہنے پر میں داخلہ لے رہی ہوں۔ وہی فیس کی ادائیگی بھی کریگا" میں جلدی جلدی کہا۔

"جاؤ، اپنے بھائی کو تار دو"۔ اس لڑکی نے مجھے مشورہ دیا۔ میں بھاگی بھاگی شہر گئی۔ محمد کو تار دیا۔ تار بارہ پونڈ میں گیا۔ اب تو میرے پاس صرف ۳۸ پونڈ رہ گئے تھے مجھے لگا کہ یہ رقم بھی بہت جلد یونہی ختم ہو جائے گی اور میں نہ رجسٹریشن حاصل کر سکوں اور نہ میرے پاس کچھ بچے گا۔

میں نے سارا دن انتظار کیا۔ ہر لمحے یہی آسرا تھا کہ اگلے لمحے رقم میرے پاس ہو گی کبھی کبھی اطمینان کی مسکراہٹ مجھے آن دبوچتی۔ میرے بھائی نے تمام سچے عربوں کی طرح اپنے وعدے کو نبھایا۔ میں واپس امریکن یونیورسٹی گئی اور رجسٹرار کو بڑے فخر کے ساتھ فیس دی۔ اس نے چند افسرانہ الفاظ ادا کئے۔ بہر حال میری رجسٹریشن ہو گئی۔ میرا داخلہ چار کورسز کے لیے ہوا۔ کیمسٹری، عربی ادب، انگریزی اور میتھیمیٹکس۔ میرے چاروں استادوں میں سے صرف ایک عرب نژاد تھا۔ باقی تین استاد اپنے نقطۂ نظر میں بھی امریکن تھے۔

رویوں اور برتاؤ میں بھی۔ وہ پراونشل سکول میں پڑھے تھے کہ جہاں کے سند یافتہ سی آئی اے کے کارندے یا وزیر ہی بنتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون سی صورت بدتر تھی۔

امریکن یونیورسٹی میں میری اوسط تعلیم ہو رہی تھی۔ میری اصل تعلیم گرعرب کلچرل کلب بیروت اور عرب نیشنلسٹ موومنٹ کے درجات میں ہو رہی تھی۔ اے۔ سی میں تو میری واقفیت عرب دانشوروں سے ہوئی مثلاً یوسف موغیزل کہ جو کلب کے صدر تھے۔ محسن ابراہیم جو کہ "الحریت" کے مدیر تھے۔ "الحریت" "عرب نیشنلسٹ موومنٹ کا سرکاری اخبار تھا۔ یہیں میری ملاقات طیسیر مقابرہ سے ہوئی۔ جو کہ فلسطینی طلباء کی تنظیم کے صدر تھے۔ میں جن ادبا اور طلباء سے ملی وہ سب کے سب بائیں بازو سے منسلک عربوں اور پاپولر فرنٹ میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

امریکن یونیورسٹی ایک طرح میرے لیے دانشمندی کا قبرستان تھی۔ یہ یونیورسٹی دراصل مشرقِ وسطیٰ کے امیر بچوں کے لیے سوشل کلب یا ادب آداب سیکھنے کا ادارہ تھی۔ طلباء کی انجمن سازی پر پابندی تھی اور یونیورسٹی کے امور ایک امریکن کارپوریشن کے امور کی طرح سرانجام پا رہے تھے۔ جن طلباء کی فیسیں پوری طرح ادا نہ کی گئی ہوں، انہیں کلاس میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس پر جن چیزوں کی اجازت تھی، وہ ڈانس پارٹیاں اور ڈرامے تھے۔ کوئی واضح سیاسی کلب بنانے کی اجازت نہ تھی۔ یونیورسٹی میں کسی قسم کے مظاہرے، سیاسی ریلی یا مہمانِ مقرر کے آنے کی اجازت نہ تھی۔

میں جیوٹ ہال ہوسٹل میں ایک امریکی ساتھی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس ساتھی کا نام جوڈی سنگر تھا۔ میں اس کی سوشل زندگی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ ایک ہفتے میں اس کی تین مختلف آدمیوں سے تین مختلف دنوں میں معاشقے ہوتے۔ ہر معاشقے میں وہ جسم و جاں کی تمام حلاوتوں سے شامل ہوتی۔ بلکہ دوسری لڑکیوں

کے سامنے اپنے محبوب کے ساتھ لب بوسی کرتے ہوئے عار بھی محسوس نہ کرتی۔ میں جب جوڈی سے پوچھتی "یہ تم سب کیسے کر لیتی ہو" تو وہ ہنس کے بے فکری سے جواب دیتی: "ارے دل کو مت لگاؤ مزے کرو۔ سب جائز ہے۔" میں بھی ہنس دیتی اور اس کی ڈھٹائی کی داد دیتی۔

جوڈی اور میں، ہوسٹل کے ساتھی سے بڑھ کر دانشورانہ ساتھی تھے۔ وہ مجھے امریکی حکومت، سماج اور اخلاقی اقدار کے بارے میں لیکچر دیتی اور میں اُسے عربوں کے بارے میں لیکچر دیتی۔ وہ آزاد خیال تھی اور کینیڈی کے پرستاروں میں تھی میں ناصر کی مداح تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ہماری دوستی امتحان میں پڑی۔ کینیڈی نے کیوبا پر حملہ کرنے کا اعلان کیا۔ اگر سوویٹ میزائل فوری طور پر کیوبا سے ہٹائے نہ گئے تو۔ ۲۰ اکتوبر کو یو۔ اے۔ آر نے سرکاری طور پر اپنی فوجیں یمن بھیجی تھیں۔ جوڈی اور میری ان معاملات پر زبردست بحث ہوتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے۔ جوڈی کہتی کہ یہ امریکہ کا حق ہے کہ وہ روس سے کہے کہ کیوبا سے اپنے میزائل ہٹا لے کہ اس طرح امریکہ بھی دفاعی طور پر خطرے کے نشان پر آ جاتا ہے۔ میرا موقف تھا کہ یمن کی جانب یو۔ اے۔ آر دستوں کو روکنے کے لیے ناصر کا اقدام گویا انقلاب کو تحفظ دینے کے مترادف تھا۔ جوڈی کا خیال تھا کہ ناصر ایک لالچی سیاست دان تھا جو خلیج کا تیل اپنے ذاتی مفادات اور عروج کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں کہتی تھی کہ تیل پر ہمارا حق ہے تو ہم جیسے چاہیں گے اس حق کو عربوں کے مفاد میں استعمال کریں گے۔ وہ ناصر کی کارروائیوں کو سوویٹ چالوں کا ایک حصہ سمجھتی تھی کہ اس کے خیال میں سوویٹ یونین ناصر کے ذریعہ عرب پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ میں نے جوڈی سے کہا کہ ہم سامراجیت کے خلاف اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ہم چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر اپنے علاقے کو دوسری بڑی طاقت کے سامنے پیش کر دیں۔ جوڈی

اپنی آزاد خیالی اور لبرل نظریات کے باوجود سامراجی ذہن کی خاتون تھی۔ میں فلسطینی عرب خاتون تھی جو بے خانماں، جلاوطنی کی زندگی، امریکن کالونی واس بیروت میں گزار رہی تھی۔ وہ ہر چیز ہار سکتی تھی اور میں ہر چیز جیتنے کی تمنا رکھتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فرد کی سماجی حیثیت ہی اس کے سماجی شعور کی نگہداشت کرتی ہے۔

ہر چند یونیورسٹی کیمپس پر سیاست ممنوع تھی اور فلسطینی طلباء کی تنظیم کی سرگرمیاں بھی بہت کم اور خفیہ تھیں اور ۱۹۶۳ء میں متحارب سیاست کا نشانہ بن چکی تھیں۔ فلسطین کی ریاست کے قیام کا اعلان کہ جس کا صدر مقام نیبلس تھا۔ ہمیں کچھ کر دکھانے کا موقعہ فراہم کر رہا تھا۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ نیبلس پہلے شاہ حسین کے قبائلی نظام کے تحت علاقہ تھا مگر خاصا احتجاج ہوا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ فلسطینی بے اطمینانی سماجی ماحول کے بارے میں اور عرب ریاستوں کے بارے میں کافی بڑھی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں نئی فلسطینی تنظیمیں ظاہر ہو رہی تھیں عرب ریاستوں کو مجبوراً ان کا نوٹس لینا پڑا اور عربوں کو مجبوراً فلسطینی اتحاد کی بات کرنی پڑی۔

پھر یہ بھی ہوا کہ امریکن یونیورسٹی بیروت میں اسی خاک اور اسی آسمان تلے مظاہرہ بھی ہوا۔ انتظامیہ نے پہلے ہماری سرگرمیوں کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا اور سوچا کہ برساتی مینڈکوں کی طرح یہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

ہم نے فوری طور پر ان افواہوں کی تصدیق چاہی کہ اردنی سفارت خانہ طلباء کو بلا بلا کر یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر انہوں نے سیاسی سرگرمیاں بند نہ کیں۔ تو ان کے پاسپورٹ منسوخ ہو جائیں گے۔ ہم نے اردنی سفارت خانے کا دوغلا پن دیکھ کر سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ اب تو کئی غیر ملکی طلباء بھی ہمارے حامی بن گئے اور ہمارے ساتھ مظاہروں میں حصہ لیا۔ اب یونیورسٹی انتظامیہ نے جوابی عمل کی

تیاری کی اور ادھر طلباء نے اپنے ایک وفد کا انتخاب کیا جو اردنی سفارت خانے جا کر فلسطینی طلباء کی نمائندگی کرے گا۔ مجھے بھی اس گروپ میں شامل کیا گیا۔ اردنی سفارت خانے میں زیادہ تر بولنے کا کام میرے سپرد تھا اور میرے ساتھی میرے مؤقف کی حمایت کر رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ یونیورسٹی کے گرد لبنانی انٹیلیجنس کے ہرکارے بڑھتے گئے۔ سفیر کو معلوم تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ہر چند وہ ظاہر کر رہا تھا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ کمیٹی کے سامنے، بہر حال سفیر کو اپنے الفاظ بدلنے پڑے اور پولیس کو کہنا پڑا کہ وہ چلی جائے کہ یہ مجرم نہیں بلکہ یونیورسٹی کے طلباء کا ایک گروہ ہے۔ محافظوں نے ہماری باری باری تلاشی لی اور کمرہ چھوڑ کر چلے گئے۔

ان کے نکلتے ہی میں نے پھر جارحانہ لہجہ میں بات شروع کر دی اور زور دیا کہ ہمیں لکھ کر یقین دہانی کرائی جائے کہ ہمارے پاسپورٹ منسوخ نہیں کئے جائیں گے۔ مگر اسے اس الزام سے انکار کرنے اور منہ سے نکلے الفاظ کی توقیر کا وعدہ کرنے کا اختیار تھا۔ ہم نے احساسِ تفاخر کے ساتھ سفیر کے ساتھ عرب کافی پی۔ ہم چونکہ انگریزی میں بات کر رہے تھے اور میں ذرا تیز بول رہی تھی تو اس نے سوچا کہ میں عرب نہیں ہوں۔ چلنے سے پہلے میں نے اس سے عربی میں بات کر کے یہ جتا دیا کہ میں عرب ہی تھی۔ فلسطینی تھی اور فلسطینی عورتیں جلد ہی انقلابی مقام حاصل کر لیں گی۔

میری باتیں سُن کر وہ پدرانہ شفقت سے مسکرایا۔

اسی موسمِ بہار میں مجھے پھر عورت ہونے پر مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اے۔ این۔ ایم نے فیصلہ کیا یونیورسٹی کے طلباء کو بھی فوجی تربیت دی جائے۔ میں درخواست دینے والے پہلے گروہ میں شامل تھی۔ اپنی سیاسی کارگزاری اور تجربے کی بنا پر یقین رکھتی تھی کہ اب کے میری درخواست کسی بیہودہ سے سبب پہ مسترد نہیں کی جائے گی۔ چونکہ میں اے۔ یو۔ بی اور جی۔ یو۔ پی۔ ایس کی انتظامی کمیٹیوں میں شامل تھی۔ اسلئے

میرے نام کو مسترد کرنا مصیبت مول لینا کے مترادف تھا۔ اب انہوں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ مجھے قائل کرنا شروع کیا کہ موسم کی سختی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی اس لیے میں تربیت پر جانے سے گریز کروں ۔ میں نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ میں ہر قسم کی مشکل برداشت کر لوں گی۔ طوعاً و کرہاً انہیں مجھے جانے کی اجازت دینا ہی پڑی۔

یونیورسٹی میں سیاست کے ممنوع ہونے کے باعث ایل۔ این۔ ایم کو خفیہ کارکردگی رکھنی پڑتی تھی۔ میرے سپرد جیویٹ ہال میں لٹریچر تقسیم کرنا اور اس علاقے کے درختوں پر پوسٹر لگانا تھے۔ میں رات کو ایک بجے یا صبح پانچ بجے یہ کام کرتی تھی ایک رات چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا۔ پہلے تو اس نے مجھے بڑا ڈرایا دھمکایا۔ مگر بعد میں وہ بھی ہماری ہی خفیہ تنظیم کا رکن نکلا پھر اس نے مجھے سمجھایا کہ پوسٹر کہاں اور کس وقت لگانے چاہئیں۔ اگر میں واقعی پکڑی گئی ہوتی تو اس کا مطلب تھا کہ فوری طور پر یونیورسٹی سے خارج بغیر پوچھ گچھ کے۔ اب میں جیویٹ ہال میں زیادہ اعتماد سے کام کرتی۔ عورتوں کے ڈاک کے ڈبوں میں بنڈل رکھ دیتی۔ ساتھ ہی ایسے پمفلٹ بھی رکھ دیتی کہ جن میں ایسے مواد کی نفی کی گئی ہو، تاکہ پتہ نہ چلے کہ دونوں چیزیں رکھنے والے آخر ہیں کون! کبھی کبھی ہمارے ہی لڑکے یہ کہتے ہوئے آتے کہ دونوں کا نقطۂ نظر جاننا ضروری ہے۔ یہی ان کا اندازِ وکالت مجھے ان کی سوچ کا پتہ دیتا۔

طلباء کو میرے بارے میں آخر تک یہ پتہ نہیں چلا کہ میں کسی خفیہ تنظیم کی رکن یا نیشنلسٹ تھی۔ بلکہ انتظامیہ کو تو یہ یقین تھا کہ جیویٹ کے نیشنلسٹ رویے کی واحد اور زوردار حامی میں ہی تھی۔ میں جب اسرائیل کی پندرھویں برسی پر لٹریچر تقسیم کر رہی تھی تو مجھے یوں دن دہاڑے کام کرتے دیکھ کر، ڈین کے دفتر میں بلایا گیا۔ ڈین نے میرے ساتھ امریکی لہجے میں بڑی کرخت انگریزی بولی۔ میں نے بن کر کہا کہ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ اب تو وہ اور بھی غصے میں آگئی اور بولی کہ کس قدر نالائق ہو۔ امریکن

یونیورسٹی کی طالبہ ہو اور انگریزی نہیں بول سکتی ہو۔ اس نے فوراً ترجمان بلانے کو کہا، اور مجھ سے پوچھا "تم نے طالبہ کے لیے جاری کردہ ہینڈبک بھی نہیں پڑھی؟" "جی میں نے پڑھی ہے۔" میں نے ترجمان کے ذریعہ جواب دیا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ آرٹیکل نمبر ۶ کی رو سے تمہیں بلا اجازت لٹریچر تقسیم کرنے کے جرم میں یونیورسٹی سے خارج کیا جا سکتا ہے؟" "جی ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے پھر ترجمان کی مدد سے کہا۔ "پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "میں جو کچھ تقسیم کر رہی تھی وہ سیاسی نوعیت کی کوئی چیز نہیں تھی۔" اس نے سیکرٹری کے ہاتھ سے پمفلٹ لے کر ایک دو پیراگراف پڑھتے ہوئے جھنجھلا کر کہا "کیا یہ آرٹیکل نمبر ۶ کے تحت نہیں آتا . . . کیا یہ سیاسی لٹریچر نہیں ہے؟" میں نے کہا "مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ پمفلٹ آخر ہوتا کیا ہے اور ڈین صاحبہ کیا بات کر رہی تھیں۔" اب بے چاری ڈین نے سیاست، سیاسی تحریر اور ایسے لٹریچر کی نوعیت، مقصد اور تحریر کو بیان کرنا شروع کیا۔ میں نے اس کی تمام باتوں اور تعریفات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے فلسطین سیاست نہیں ہے۔ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے اور مجھے کوئی شخص امریکی یا وہ شخص جو عربی نہیں بول سکتا، یہ نہیں بتا سکتا کہ مجھے اپنے ملک کے لیے کس طرح لڑنا اور جدوجہد کرنا چاہئے۔ ڈین نے مجھے ضدی شاگرد سمجھ کر یہی بہتر جانا کہ مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے تاکہ مجھے تنظیم کا مطلب سمجھ میں آ سکے۔ "تم کر کے تو دیکھو۔" اب میں براہِ راست انگریزی میں چیخی "تم سی۔ آئی۔ اے کی ایجنٹ! ایک دن آئے گا کہ میں تمہاری جگہ کرسی پر بیٹھی ہوں گی اور تم جیسوں سب کو خارج کر دوں گی۔" میں اس کے دفتر سے نعرے لگاتی ہوئی نکلی "زندہ باد فلسطین زندہ باد اے۔ این ایم پائندہ باد انقلاب"

یہ سن کر تو ڈین بے ہوش ہونے والی ہو گئی۔ میرا خیال ہے اپنی افسرانہ کرسی پر

بیٹھنے سے پہلے اس نے دوچار اعصاب کو سکون بخشنے والی گولیاں کھائی ہوں گی۔

۱۹۶۳ء میں میں نے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ ہر چند میری کوئی امتیازی پوزیشن نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے کر تعلیم مکمل کروں۔ مگر میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ اب مجھے کام کی تلاش تھی۔ اب تک کی میری نصابی تعلیم بالکل بیکار تھی۔ اس سے مجھے کچھ بھی پائیدار نوعیت کی اخلاقیات نہیں ملی تھیں۔ اس عرصے میں صرف سیاست اور انقلاب کی جدوجہد کی چند چنگاریاں ملی تھیں جو کہ نصابی تعلیم کے حوالے سے نہیں تھیں۔ تعلیم کے ابتدائی تین سالوں میں مجھے تاریخ اور ادب اچھے لگتے تھے۔ تعلیم کے اختتام پر مجھے میتھیمیٹکس اور کیمسٹری اچھے لگنے لگے۔ پھر میں نے فارماکیولوجی یا زراعت میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کا سوچا کہ جب ہم فلسطین واپس جائیں گے تو ہمیں سائنسی بنیادوں پر کاشت کر کے ہی زمین کا صیہونیوں سے بہتر استعمال کا مظاہرہ کر سکیں گے۔

سکنڈری سکول کے ابتدائی تین سالوں میں، میں نے لنکن، لینن، ہٹلر اور نپولین کے بارے میں پڑھا۔ شروع شروع میں میں ان سب کی بڑی مداح رہی اب میں لنکن کو اپنے زمانے میں لبرل ہونے پر اور لینن کو انفرادی طور پر عظیم تاریخی کارنامہ انجام دینے پر بڑا مانتی ہوں کہ جس کی تقلید ماؤ، ہوچے منہ اور چے گویرا نے کی، پہلے میں ہٹلر کو بھی عظیم مانتی تھی کہ وہ یہودیوں کے خلاف تھا، بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ وہ تو یہ سب کچھ ذاتی افتخار کے لیے کرتا ہے۔ پھر مجھے وہ بھی اچھا نہ لگا۔

ادب میں مجھے ڈکنز اور شا اچھے لگتے تھے۔ مجھے ان کی تمام تصانیف پسند تھیں بلکہ میں نے شا کی نقل میں مضامین لکھنے کی کوشش بھی کی۔ استاد کو میری نقل اتارنے کی کوشش اچھی نہیں لگی۔ مجھے شیکسپیئر بر خود غلط طول کلامی کے باعث اچھا نہیں لگتا تھا۔ عربی شاعری میں، مجھے اُمیہ اور عباسی دور کی شاعری اچھی لگتی تھی۔ بس میری

کل یہی تعلیم تھی۔

۱۹۶۰-۶۱ء میں میرے پاس کافی وقت تھا۔ اس وقت میں نے گاندھی کو پڑھا اس کی اخلاقی علمداری بہت اچھی تھی مگر مجھے لگا کہ وہ پیدائشی غلام تھا اور اس نے کبھی غلامی سے اپنا پیچھا نہیں چھڑایا تھا۔ ذاتی اور سماجی سطح پر میں عرب لڑکی کی طرح نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ چھ سال تک مجھے اپنا ایک فلسطینی کلاس فیلو کہ جو کسی زمیندار گھر سے تھا، پسند رہا۔ پہلے تو اس کے لڑکیوں سے خصوصی اجتناب برتنے کے رویوں نے مجھے اس کی جانب مائل کیا۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اس کی لڑکیوں سے نفرت کی نفسیاتی وجہ خود اس کے سامنے، اس کی ماں کی اسرائیلیوں کے ہاتھوں عصمت دری تھی جو اُسے بالکل نہیں بھول رہی تھی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب یہ لوگ ۱۹۴۸ء میں صدفہ کے علاقے سے ہجرت کر رہے تھے جس لمحے وہ خود کمانے کے قابل ہوا۔ اس نے اپنی ماں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب سے میں امریکن یونیورسٹی آئی ہوں، میں عدیل سے نہیں ملی نہیں معلوم کہ وہ ہمارے مجاہدین میں شامل ہے کہ شہداء میں۔ شاید وہ مایوس ہو کر عرب کے کسی شہر کے مضافات یا کچی آبادی میں رہ رہا ہو گا۔

میرے وقتاً فوقتاً دوست بنتے رہے مگر میں کسی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا وقت نہ نکال سکی کہ میرا اصل عشق تو انقلاب تھا۔

کویت میں جلاوطن

(۱)

"کویت اور خلیج عرب میں ہر وہ شخص جو کویت کا نہیں
وہ غیر باشندہ ہے سوائے برطانوی امریکی اور ان کے
حامیوں کے"
کاتب کردنی

عرب نیشنلزم تو انیسویں صدی کا خیال تھا۔ اس کا پہلا پیکر تو ادبی محرکین نے تخلیق کیا کہ جو یورپی خیالات و فلسفہ اور برطانوی اور فرانسیسی یونیورسٹیوں کے مصنفین کے خیالات سے آگاہ تھے۔ طلبا اور معلمین نے آگے آکر اس خیال کو اوّلیت دی اور عرب کلب قائم کئے۔ پھر صدی کے بدلنے کے ساتھ ساتھ، عرب فوجیوں نے بھی ان کلبوں میں شمولیت اختیار کی۔ اس زمانے کے نیشنلزم کی کوئی خاص متعینہ تعریف نہیں تھی اور نہ ہی لائحہ عمل واضح تھا۔ نیشنلزم چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا مگر اس کا دائرۂ اطلاق مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ ٹھہرتے تھے۔ کچھ اہم دانشوروں مثال کے طور پر الافغانی نے "اسلامی غسل" کا نام دیا اور عربزم اور اسلام میں امتیاز کرنا فراموش کر گئے۔ اس کے خیال کو مغربی حاشیہ برداروں اور مستحکم کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے خود لبرل جمہوری خیالات، عالم اسلام ہی میں وقوع پذیر کی ٹاکم ٹوئیوں میں اُلجھے رہے۔

الافغانی اور اس کے مقلدین کا خیال تھا کہ اسلام کو درپیش مشکلات تہذیب اور برادری سے متعلق ہیں۔ ان کے خیال میں ۱۷۹۸ میں نپولین کا مصر پر حملہ اور بعدازاں فرانس کا مغربی عرب پر تسلط، پھر مصر پر برطانیہ کا قبضہ، دراصل اسلام اور عیسائیت کی جنگوں کا تسلسل تھا۔ ان کے پاس تو اس کا بالکل سیدھا جواب تھا کہ مسلم دنیا کو ایک برادری کی طرح ردِ عمل کا اظہار کرنا چاہیئے کہ مغرب کی گرسنگی کو دبوچا جا سکے۔ عرب اور مسلم ایک ہیں۔ تمام مسلمانوں کو اجتماعی عمل کرنا چاہیئے اور اسے اجماعِ اُمت کہا جاتا ہے۔

اس بات کی وضاحت میں کوئی تیس سال لگے کہ عربزم اور اسلام دو الگ الگ نظریات ہیں۔ یہ اعلان بہت سوں کے لیے حیران کن، تعجب خیز اور انگلیاں دانتوں میں دبانے والا تھا۔ انہیں تو یہ پتہ تھا ـــــ کہ کس طرح صلیبی جنگیں لڑی جاتی ہیں اور کس طرح عیسائیوں کے ساتھ یہ مذہبی لڑائیاں معنی رکھتی ہیں۔ اب ان کے ہم مذہب ترکوں نے مشرقی عرب کو ترک نیشنلزم کا بخار دیا جو انیسویں صدی سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک جاری رہا۔

عربوں کا ردِ عمل بہت حیران کن تھا۔ انہیں یہ جلد سیکھنا تھا کہ سب مسلمان بھائی بھائی نہیں تھے اور ترک، عرب نہیں تھے۔ یہ بھی کہ دنیا مذہب کی اساس پر نہیں بلکہ سرمائے کی اساس پر قائم تھی۔ ریاستیں اور جماعتیں، باہمی مفادات کی بنیاد پر نہ کہ مذہبی قرابت کی بنا پر قریب آ رہی تھیں۔ یہ بھی کہ عربوں کو دنیا کے بارے میں اپنا زاویۂ نظر بدلنا پڑے گا یا پھر محکومیت کی زندگی کو قطعی سمجھنا پڑے گا۔ ان معاملات پر حاوی آنے کے لیے کوئی ایک سیاسی پارٹی کام نہیں کر رہی تھی۔ البتہ دمشق، قاہرہ اور بیروت میں افراد اور گروہ تھے جو یہ بات کرتے تھے۔ اوثمان آرمی میں بھی "نوجوان ترکوں" کے نام سے نیشنلسٹ افسروں نے ایک گروہ بنایا تھا۔ ان افسروں

کو باقی ترک حقارت سے اس لیے دیکھتے تھے کہ یہ باقی نوجوان ترک گسی اور مار پر تھے۔ یہ جا کر ۱۹۰۱ء میں کھلا کہ انہوں نے قومی خود مختاری کے اصولوں کی بنیاد پہلا مرکز ریاست کا منصوبہ مسترد کیا تھا۔ ان افسروں، دانشوروں اور طلباء پر مشتمل افراد نے ہی ۱۹۱۶ء کے عظیم عرب انقلاب کے لیے درجات فراہم کیے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں دمشق کی مرکزیت میں عرب ریاست ۱۹۲۰ء میں وجود میں آ گئی تھی۔

انقلاب اور اس کے رہنما اور متعلقین کو بہت جلد دبا دیا اور الگ الگ کر دیا گیا۔ عرب کا مشرقی حصہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور اس پر برطانوی اور فرانسیسی سامراجیوں نے قبضہ کر لیا۔ جنہوں نے ان علاقوں کو سیکس پیکوٹ معاہدے کے تحت آپس میں تقسیم کر لیا اور یوں لبنان اور شام فرانس کے قبضے میں عراق، فلسطین اور اردن کا علاقہ، برطانیہ کے قبضے میں آ گیا۔ غیر دینی عرب نیشنلسٹ ختم کر دیئے گئے مذہبی رہنماؤں کو ریاست نے خرید کر اعزازات دیئے۔ حشمتیوں اور ان کے لواحقین کی قسمت کا ستارا، برطانوی حکومت کے کرم کے باعث عروج پر رہا۔ البتہ نیشنلزم کا خیال کہیں نہ کہیں اور خاص کر مشرقی عرب میں جاری رہا کہ یہ علاقے برطانیہ اور فرانس کے زیرِ اثر ہونے کے باوجود اب بھی ایسی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ فلسطین نئی الفور اعلامیے کے تحت صیہونیوں کو دے دیا گیا تھا۔

نیشنلزم کے تصور کو سوشلزم سے متعلق کر کے سمجھنے میں اور فروغ دینے میں کم از کم آدھی صدی کی محنت درکار تھی کہ موجودہ طبقہ، امراء اور جاگیردار کو ختم کرنے کی کوششوں میں کم از کم تین بار تو شکست مقدر ہونا تھی۔ ان شکستوں کو صیہونیوں کو اپنی فتح کا نقارہ سمجھ کر بجایا اور یوں اپنے لیے اور گہری قبریں خود کھود لیں۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان نیشنلسٹوں نے سیکولر لبرل سوشلزم کے خیال کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ وہ ناکام ہوئے کہ سیکولر اور جاگیردار،

دونوں طبقوں نے اپنے خیالات کی بنیاد مغربی فلسفے اور سرمائے پر رکھی اور یوں عوام کی حمایت نہ حاصل کر سکے۔ البتہ لبرل سوشلسٹوں نے اپنے وسیع الظرف نقطۂ نظر کے باعث (جس میں مصر کی وفد پارٹی کا اثر بھی شامل ہے) عربوں کو مغرب دشمنی کا قائل کر لیا۔ دوسرے الفاظ میں عرب کمزور اور منقسم رہے اور مغرب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مغرب کی پالیسیوں اور اس کے حواریوں نے ہمیشہ عوام سے دور رہنے اور اوثمان وارثوں کی طرح محض حکومت کرنے سے کام رکھا۔

۱۹۴۸ء میں عرب بنیاپن کا تختہ صیہونیت نے الٹ دیا۔ اب نتیجۃً عرب سرمایہ دار نے بین عرب۔ نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہو کر اپنے مفادات کو محفوظ کرنے کی کوشش میں "عرب باتھ" محاذ بنایا۔ یہ عرب باتھ" واقعی جاندار ثابت ہوا۔ ایک طرف عرب نیشنلزم دوبارہ زندہ ہوا۔ دوسری طرف اس کو سیکولر طرزِ فکر کے طور پر اپنایا گیا۔ عرب باتھ (۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۷ء) کے درمیان وجود میں آیا اور یہ گزشتہ اسلامی باتھ سے مختلف حیثیت میں وجود آیا تھا۔ باتھ کے سلوگن تھے "آزادی۔ اتحاد اور سوشلزم" البتہ اس میں عرب انقلاب کی روح کار فرما نہیں تھی۔ کیونکہ پیچھے کار فرما ذہنوں کو لبرل جمہوریت اور سوشلزم کے باہمی امتیاز و فرق کا علم ہی نہ تھا۔ علاوہ ازیں ان کردہ رہنماؤں کو ذاتی ترویج و تحریک، بمقابلہ اجتماعی اور عوامی تحریک زیادہ پسند تھی گویا "باتھ" نیم پختہ اور نیم بالغ ذہنی پختگی کی دلالت کرتا تھا۔ اس لیے وہ حالات کا احاطہ کرنے اور معاشرے سے رابطہ استوار کرنے کا اہل نہ تھا۔ چھٹی دہائی میں تو اس کے فوجی رہنما بالکل عوام پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ کرنل اپنے کرنلوں پر اور عام آدمی اپنے قبائلی ساتھی پر اعتماد کرتا تھا۔ جبکہ دانشور اپنے مفلوج سامعین پر۔ ۱۹۷۰ء میں باتھ صرف نام کا ادارہ رہ گیا اور وہ انقلابی علامات کہ جن سے عرب معاشرے کی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی تھیں، مفقود ہو گئیں۔

بہت سے نیشنلسٹ تو کہتے ہیں کہ باتھ تو ۱۹۴۰ء ہی میں ختم ہو گیا تھا کہ ان کے اتحاد میں اولین مقصد فلسطین کا مسئلہ تھا۔ ان نیشنلسٹوں نے باتھ کی جگہ عرب اتحاد کا ایک اور ادارہ قائم کیا" کاتبِ الفدا العربی" ۱۹۵۲ء۔ ۱۹۵۷ء کے درمیان یہ لوگ "الشباب العربی" یعنی عرب نوجوانوں کے نام سے جانے گئے۔ ۱۹۵۲ء ہی میں ان ان کو "عرب نیشنلسٹ موومنٹ" بھی کہا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں یہ تحریک بھی ختم ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں عرب ورکر سوشلسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ فلسطین کی آزادی کے لیے پاپولر فرنٹ جو نومبر ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا تھا اسی میں اے۔ این۔ ایم کی شاخ برائے فلسطین بھی قائم کر دی گئی۔ آغاز میں یہ تحریک جذباتی نیشنلسٹوں کا مسکن تھی جس کی آبیاری سانش الحاری نامی ادیب کی تحریروں سے ہو رہی تھی۔ اس ادیب کا نیشنلزم کا فلسفہ تاریخ اور زبان سے اپنے ماخذ تلاش کرتا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں موومنٹ پھر بحران کا شکار ہو گئی۔ انقلابی نیشنلزم کو ایک نئے جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔ سماجی سوالات بنیادی اہمیت حاصل کر رہے تھے جن کی یہ اخلاقی، ذہنی اور تاریخی توجیہہ دیکھی تو میں بھی ممبر ہو گئی۔ اے۔ این۔ ایم کا بنیادی انتظامی عملہ، امریکن یونیورسٹی بیروت کے گریجویٹ طلباء پر مشتمل تھا۔ ان میں اہم شخصیات تھیں۔ ڈاکٹر جارج حبش، ڈاکٹر ودیع حدد۔ حانی الہندی اور احمد الخطیب۔ گویا اولین رضاکار وہ افراد تھے جو ۱۹۴۸ء کی تباہ کاری کے بعد فلسطین سے نکلے تھے۔

صیہونی ریاست کے قیام نے اس موومنٹ کو بھی جلا بخشی کہ رہنما مقبولِ عام تھے۔ سامراجیت کے خلاف تھے اور نیشنلسٹ تھے۔ اسرائیل ان کا بنیادی دشمن تھا اور عرب عوام ان کے عمومی دوست تھے۔ اس لیے ۱۹۵۰ء کی جنگ میں تمام نوجوان نیشنلسٹ ان تمام حریفوں کے ساتھ لڑے جو مغربی اتحاد کے زیر اثر تھے، خاص کر اردن اور عراق کے حمی خاندان اور عرب کے وہ مڈل جو مغربی سرمایہ پرستی کو

بنیادی تصور قرار دیتے تھے۔ ناصر کو تیسری دنیا کے ملکوں میں خوب عروج ملا تھا خصوصی طور پر روس اور چیکوسلوواکیہ کے ساتھ فوجی اہمیت کے معاہدے اور نہر سوئیز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد تو نیشنلسٹوں نے اس تحریک کو ناصرازم کے نام اگلے دس سال تک خوب ترویج دی۔ ناصر کو اپنی قوت اور تحریک قوت پر فخر حاصل تھا جبکہ اے۔ این۔ ایم رہنماؤں کو عوامی تحریک پر اعتماد تھا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں اے۔ این۔ ایم کے کارپرداز ان مسلح جدوجہد اور سائنسی سوشلزم کے قائل ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء میں ناصر کا انتقال ہوا، عوامی جدوجہد کے رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ سپاہی ڈپلومیٹ کی حیثیت سے۔

اسی دوران ناصر اور موومنٹ کی قرابت، شامی نیشنلسٹ لیڈر سراج اور مصری سیاسی مفکر ابولنور کے باعث مستحکم رہی۔ اس رشتے کو تقویت ۲۱ نومبر ۱۹۶۱ء کو ملی تھی جبکہ حانی اہندی نے شامی وراثت اور سیاست کے بارے میں سوالات بحوالہ عرب انقلاب اٹھائے تھے۔ اس وقت ناصر کا نظریۂ سیاست "مصری سوشلزم" بن چکا تھا۔ ڈاکٹر جارج حبش ۱۱ اپریل ۱۹۶۴ء کو ناصر سے اے۔ این۔ ایم کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ملے اور ناصر کی استدلالی صلاحیت اور عوامی مسائل پر گرفت سے خاصے متاثر ہوئے۔ ناصر اس وقت تک شامی علیحدگی کے صدمے سے جانبر ہو چکے تھے۔ البتہ یہیں سے فلسطین کی تحریک اور اے۔ این۔ ایم کے سیاسی نظریات ناصرازم سے آگے نکل گئے۔ اختلاف، جنوبی یمن کے مسئلے پر پیدا ہوا۔ اس صورتحال کو بھی ناصر اپنا مسئلہ ہی سمجھتے تھے اور خود ہی حل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنوبی یمن کو آزاد کرانے کے لیے فرنٹ (فلوسی) بھی قائم کیا جس کی سربراہی "سنجق" کر رہے تھے۔ جبکہ اے۔ این۔ ایم نے اپنا یونٹ مرتب کیا (ایف۔ ایل۔ این) مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا اور کسان انقلاب پرست ہو گئے۔ "فلوسی" قاہرہ کا قرب حاصل کئے ہوئے اب

بھی برطانوی حکام سے مصالحت کے لیے کوشاں تھے۔ آخر کو برطانوی حکام باہر نکال دیئے گئے اور نومبر ۱۹۶۷ء میں جمہوریۂ جنوبی یمن قائم ہو گئی اور اسی کے ساتھ "فلوسی" بھی نقشۂ زمین سے غائب۔ ناصرازم اب افق سے معدوم ہوتا جا رہا تھا اور اے۔ این۔ ایم انقلاب اس کی جگہ لے رہا تھا۔ جون کی جنگ کے بعد تو اے۔ این۔ ایم انقلابی عرب عوام کے آئینہ دار اور نمائندے بن گئے کہ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عوام انقلاب لاتے ہیں اور ہم اس پر قناعت کر رہے تھے کہ انقلاب آ رہا ہے۔

اس لیے میں کُل وقتی انقلابی ہو گئی۔

---

(۲)

۱۹۶۳ء کے موسم سرما میں اسرائیل کو بنے پندرہ برس ہو گئے تھے مجھے اندازہ ہوا کہ میں اب کے خزاں میں یونیورسٹی نہیں جا سکوں گی۔ فیصلے کی گھڑی میرے سر پر تھی۔ کچھ کام کرنے کے امکانات بھی تھے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی لبنان میں نہیں تھا۔ میں انیس برس کی ہو گئی تھی۔ مجھے خدمت کے لیے شوہر کی تلاش نہ تھی کہ میں گھر میں رہ کر پلنے اور پالنے والی مخلوق نہ تھی۔ اسی مدوجزر کے زمانے میں ایک خاندانی مسئلے نے مجھے لبنان سے باہر پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

میرا خاندان پندرہ سال تک آبائی سرزمین سے جلاوطنی میں رہا۔ چونکہ جنگ گاہے بگاہے جاری رہتی تھی۔ اس لیے حیفا یا مجدی الکروم سے کوئی رشتہ دار بھی ملنے نہ آ سکتا تھا کہ سفر کی پابندیاں بھی شدید تھیں۔ افسری سرخ فیتہ بھی بے پناہ تھا اور پھر مالی مسائل ان سے بڑھ کر۔ بہرحال کافی سوچ بچار اور تیاریوں کے بعد میرے ابا، اپنے خاندان سے ملنے منڈل بوان گیٹ یروشلم میں گئے۔ انہوں نے وہاں تین دن تک انتظار کیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ چند ہفتوں بعد پھر ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اب ابا پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ نہ جا سکے۔ اب اماں گئیں۔

یہ ملاقات تھی کہ خاردار تاروں کے درمیان ہولناک خواب۔ جب دادی ماں نے میری اماں کو دیکھا تو سوچا کہ ابا مر چکے ہیں اور یہ سوچتے ہی وہ بیہوش ہو کر گریں۔ میری چچیاں، بھائی اور بہنیں اور اماں نے آنسوؤں کے درمیان ایک گھنٹے تک بات چیت کی۔ بات چیت بھی کیا تھی گزشتہ کا نوحہ اور جتنے نام یاد تھے ان کا احوال، ہم ایک دوسرے کو اس سوال کی صلیب کے نیچے لٹکے دیکھتے رہے کہ زندگی میں پھر ملنا بھی نصیب ہوگا کہ نہیں۔ کوئی شخص مکمل بات بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پہرے دار سر پر کھڑے تھے۔

جب اماں نے دادی ماں کو خدا حافظ کہا تو دادی ماں نے اپنا ہار اتار کر اماں کے گلے میں ڈال دیا اور پیار کیا۔ اسرائیلی محافظوں نے یہ دیکھ لیا۔ اس نے اماں کے گلے سے ہار نوچ لیا۔ اماں نے چھینا جھپٹی کی کوشش کی۔ مگر جیتنا تو ہتھیار والے نے تھا۔ اماں عربوں کی کم ہمتی پر بین کرتی اور اسرائیلیوں کی ہٹ دھرمیوں پر آہ و فغاں کرتی واپس آئی۔ اس وقت سے اب تک ہم نے اپنے رشتہ داروں کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ ابا، اپنی ماں اور بہنوں کی اٹھارہ سال تک شکل دیکھے بغیر دنیا سے سدھار گئے۔

مگر اس صورتِ حال میں میرا کیا کام تھا۔ مجھے کہاں جانا تھا۔ مجھے جنت میں پناہ نہیں ملتی تھی۔ مگر دوزخ بھی کونسا کھلا تھا۔ فی الوقت صرف کویت ہی کا راستہ کھلا تھا کہ امکانات کا اوّل و آخر یہی تھا۔

سامنے ٹکڑا پھینکنے کے مترادف تخلیق کیا اور مخلص لوگوں نے رہنماؤں کے اخلاص پر اعتماد کیا

جون کے مہینے میں حالات اور بھی ابتر ہو گئے۔ پی ایل او کو مفلوج کرنے کی کوشش کی گئی کہ عرب ریاستوں نے نہ تو فلسطینیوں کو الگ اور آزادی سے کام کرنے کی اجازت دی اور نہ ہی فلسطینیوں نے اپنے مفادات کا تحفظ کیا کہ پی۔ایل۔او میں امرا طبقے کے افراد جگہ حاصل کرنے لگے تھے اور پی۔ایل۔او کا ڈھانچہ عرب لیگ ہیڈکوارٹرز پر نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ نہ اس کا کام آزادی کے لیے لڑنا تھا اور نہ مہاجرین کے مفادات کا تحفظ [1]

---

[1] مصنف سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

۳۱

۱۹۶۳ء کے موسم گرما میں ساری عرب دنیا میں فلسطین کا نام گونجنے لگا۔ بے شمار فلسطینی کہ جن میں میں بھی شامل تھی، فلسطین کے نام پر قائم ہونے والے ادارے کے بارے میں سوچنے لگے۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں عرب لیگ ممالک نے فلسطین تنظیم آزادی پی۔ایل۔او کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے قیام کا مطلب فلسطینیوں کو مجتمع کرنا اور انہیں آزادی کے لیے منظم کرنا تھا۔ اس وقت صرف چند سمجھ دار لوگوں نے عرب سرگرمی کی اصلیت کو محسوس کیا۔ مگر جنہوں نے محسوس کیا، طاقت ان کے ہاتھوں میں نہ تھی۔

قاہرہ کے عظیم الشان صدارتی محل میں عرب بادشاہ و صدر صاحبان نے میٹنگ کی۔ ہر چند انہوں نے آپس میں اسرائیل سے نہ لڑنے کا عہد کیا۔ مگر لوگوں کو یہ سمجھاتے رہے کہ وہ ہر وقت جنگ کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے مشترکہ فوجی کمان کا اعلان کیا کہ جس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی۔ کئی ہفتوں بعد، لبنان میں اپنی ناکامی کا الزام خود لبنان کی انتظامیہ اور شامی اور اردنی حکومت پر ڈالنے کی کوشش کی۔ ان کارپردازان نے اردنی پانیوں کا رخ موڑنے کے لیے۔ ۱۳ ملین پونڈ مختص کیے، مگر اتنے پیسے تو ایک کھال کھودنے کو بھی ناکافی ہوتے ہیں۔ انہوں نے پی۔ایل۔او کو فلسطینیوں کے

(۴)

ستمبر ۱۹۶۲ء میں میں کویت روانہ ہوگئی۔ نیم دلی کی سی کیفیت تھی۔ توقع بھی تھی کہ ملازمت مل جائے گی اور یہ ناامیدی بھی کہ شاید یہ سفر بھی رائیگاں جائے۔ تین ماہ تک میں بیکار رہی۔ وزارتِ تعلیم حکومتِ کویت کے مراسلے کی منتظر رہی۔ آخر دسمبر کے وسط میں جواب ملا کہ شہر کویت سے ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع الجاہرہ میں ایک نوکری مل سکتی ہے۔ کویت شہر میں میرا بھائی رہتا تھا۔

ان تین ماہ کی بیکاری میں، میں نے عالمی صورتِ حال اور زندگی کی معنویت پر بڑا غور کیا، خاص کر کینیڈی کے قتل کے بعد کہ اس کے قتل کا مجھ پر جذباتی اثر ہوا تھا حالانکہ وہ اس ملک کا صدر تھا کہ جس کے رویے کے باعث ہم اپنے ملک سے جلاوطن ہونے پر مجبور تھے اور یہ ملک صیہونیت کے فروغ کے لیے کام کر رہا تھا۔ کینیڈی نے اپنے دورِ حکومت میں تین کٹر صیہونی یہودیوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا تھا۔ اس نے اپریل ۱۹۶۱ء میں کیوبا پر حملے کو جائز قرار دیا تھا اور میں اتنی سخت فلسطینی جدوجہد کی قائل خاتون۔ انقلابی۔ کینیڈی کے قتل کی خبر سن کر رو پڑی تھی۔ میں نے ٹی وی پر جنازے کا منظر اور امریکیوں کو روتے دیکھا۔ اس وقت میں

امریکیوں کو لفنگوں اور غنڈوں کی قوم سمجھتی تھی کہ جو ہر جرم بلا کم و کاست کر سکتے تھے۔ یہ جنازہ دیکھ کر میں نے اپنی رائے تھوڑی سی بدلی تھی، مگر پھر لنڈن جانسن کے لالچ اور نکسن کی منافقت نے میرے اندر امریکہ کا اوّلیں تصور زندہ کر دیا۔

میں شاید کینیڈی کے لیے اس لیے روئی تھی کہ مجھے چند عرب نوجوانوں کی طرح توقع تھی کہ کینیڈی فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی کے لیے ضرور کچھ کرے گا۔ جیسا کہ کینیڈی۔ ناصر خط و کتابت سے بات ظاہر بھی ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے آنسو، محض انسانی جذباتی ردِ عمل تھے۔ میرے سارے تعصبات بھی انہیں نہ روک سکے۔ مگر میں ان آنسوؤں پر نادم نہیں ہوں۔

بیروت یونیورسٹی کی طالبہ اور بیروت کی سیاسی ہل کے پرزے کے لیے "الجاہرہ" بہت ہی بور جگہ تھی۔ ہم کویت حکومت کی نظر میں سب کے سب "غیر ملکی" تھے۔ البتہ اس سکول میں بہت سے لحن اور لہجوں میں عربی بولی جاتی تھی۔ مصری، فلسطینی اور شامی، تین بڑے گروپ تھے۔ میں پہلی دفعہ مصریوں کو قریب سے مل رہی تھی۔ شامی بالکل فلسطینیوں کی طرح تھے سوائے پرنسپل کے جو شامی ہونے کے باوجود افسر اور ظالم خاتون تھیں کہ جس نے اپنی اساتذہ کو قابو میں رکھنے کے لیے ان پر سراغ رسانی کا کارگر جال بچھایا ہوا تھا۔ معاملات میرے لیے زیادہ خطرناک تھے کہ مجھے قاعدوں اور کرداروں کے تصورات کی پابندیوں کا ادراک نہ تھا۔ مجھے حاکم و محکوم کی تخصیص کرنی نہیں آتی تھی۔ مجھے افسرانہ یادداشتوں اور بیرونی حاکم کا کوئی امتیاز کرنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ مجھے تو صرف ریجنل کمانڈر کمانڈو کا حکم ماننا آتا تھا۔ اس وقت تو میری دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی۔ میری ساتھی یا تو میری جانکنی پر خوش ہوتے تھے یا اپنی بزدلی پر افسوس کرتے تھے یا میری باغیانہ طبیعت پسند کرتے تھے یہ ایسے غلام تھے جو بادشاہ کے سامنے کانپتے اور سر جھکاتے تھے

اور پیچھے چغلیاں کرتے تھے۔

"الجاہرہ" سے ہم بلا اجازت کیمپس سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ جمعرات کی رات ہم قریبی خاندانی افراد سے مل بھی سکتے تھے اور ان کے گھر رات بھی گزار سکتے تھے۔ نہ وہاں کوئی سینما تھا نہ کوئی ایسا لڑکا دوست کہ جس کے ساتھ وقت گزارا جا سکے کوئی برطانوی میوزیم کی طرح کی جگہ بھی نہ تھی کہ کچھ سیکھا جا سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ ہم خواجہ سراؤں کا قبیلہ تھے جو مشرقی جبر کی کٹھالی میں پڑے ہوئے تھے۔ مجھے وہ چھوٹے چھوٹے واقعات یاد ہیں جب میں نے ارادتاً حکم عدولی کی۔ پرنسپل نے مجھے چھوٹے بازوؤں کی قمیض پہننے پر کیمپس سے خارج کرنے کی دھمکی دی۔ میں نے اُسے اپنے بدن کو مزید ننگا کر کے آنے کی دھمکی دی اور غصے میں آ گئی مگر اپنے کہنے پر عملدرآمد نہیں کر سکتی تھی۔ پھر مجھے پیغام ملا کہ اگر میں ایسا ہی روّیہ اختیار کئے رکھی تو پرنسپل وزارتِ تعلیم کو اس ناگوار رویّے کے بارے میں مطلع کرنے پر مجبور ہو گی۔ پرنسپل نے یہ تو براہِ راست نہ کیا۔ البتہ میری تبدیلی کسی اور جگہ کرنے کے لیے لکھ دیا۔ میں خوش تھی کہ شاید بہتر ماحول میسر آ جائے۔ ہر چند "الجاہرہ" کے اچھے دوستوں سے بچھڑنے کا غم تھا۔

"الجاہرہ" میں پڑھنے والے بچوں کے لیے غلامی سے آزاد رہنے اور آزادی کے لیے لڑنے کا ہنر سکھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے بہت چھپ چھپا کے اور مشکل سے بچوں تک یہ راستہ بنایا تھا کہ بچے بڑی ذہانت سے بات کو سمجھ لیتے تھے۔

میں نے اس دوران اے۔ این۔ ایم سے اپنے تعلق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ورنہ یہ سیاسی خودکشی کے مترادف ہوتا اور لیڈی پرنسپل اس خدا بخشی پر بہت ہی خوش ہوتی اور مجھے نکلوا کر اعزاز حاصل کرتی۔ جو بچے میری باتیں سنتے تھے ان کے والدین کو بھی علم نہیں تھا کہ بچے کیا کچھ سیکھ رہے ہیں۔ بہرحال "الجاہرہ" کا ماحول خوب پُرلطف تھا۔ خاص کر اُن لوگوں کے لیے جو سیاسی ترغیبات نہ رکھتے ہوں۔

(۵)

موسمِ بہار آیا۔ عرب حکومتیں شور مچا رہی تھیں کہ اسرائیل دریائے اردن سے عربوں کے حصے کا پانی بھی چرائے جا رہا ہے۔ انہوں نے دس سال تاخیر سے دریا کا رُخ اپنی جانب موڑنے کی کوشش کی۔ مگر اب تو تاخیر بہت ہو چکی تھی۔ اسرائیلیوں کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوئی دفاعی کوشش نہیں کی گئی سوائے اِکا دُکا انفرادی کوششوں کے۔ یہی منافقانہ روّیہ کوئی ایک سال تک چلتا رہا۔ اس دوران اسرائیل کام کرتا رہا اس نے دریا کا رُخ اپنی جانب موڑ لیا اور سارا پانی وہی حاصل کرتا رہا۔

اس دوران قابلِ صد احترام بادشاہان و صدورِ مملکت ہائے عرب نے فلسطین کے لوگوں سے مشورہ کئے بغیر یا دوسرے امیدواروں کی صلاحیت دیکھے بغیر احمد شکیری کو پی۔ ایل۔ او کا چیئرمین مقرر کر دیا۔

شکیری، ان کا آدمی تھا۔ وہ ان کی مرضی کے مطابق اور فلسطینیوں کی مرضی پوچھے بغیر فلسطین کے بارے میں ایسے بیان داغ سکتا تھا کہ جس میں فلسطینیوں کو دفاعی امور کیلئے مجتمع بھی نہ کیا جا سکے اور لوگ شریک بھی نہ ہو سکیں۔ یہ لیڈر شپ، حکّام بالا کی مقرر کردہ تھی اور انہی کے سامنے جوابدہ تھی۔

شکیری، عالم عرب کا دورہ کر رہا تھا کہ فلسطینیوں کو تحریک دے۔ اسی دورے کے سلسلے میں وہ کویت بھی آیا۔ تحریک دینے کا مقصد تھا کہ فلسطینی اپنے نمائندے منتخب کر کے اپنی آئینی اسمبلی اور پارلیمنٹ بنائیں۔ کویت میں اُس نے اپنے شناسا لوگوں سے رابطہ قائم کیا مثلاً فلسطینیوں کا طبقۂ امرا جو اب کویت میں انجینئر یا چھوٹی صنعتوں کے نیجر جیسے عہدوں پر فائز تھے۔ مہاجرین کے بچوں، اسکولوں کے اساتذہ یا مزدور طبقے کے لوگوں سے رابطہ قائم نہیں کیا گیا۔ ان کا کام صرف تالی بجا کر تصدیق کرنا تھا۔ چونکہ کویت میں مقیم اور خلیج میں موجود فلسطینیوں کو کسی قسم کے اجتماع اور تنظیم کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے ان کے مجموعی جذبات اور ردِّ عمل کو سمجھنا مشکل بھی تھا۔ اس صورتِ حال سے چند خود غرض، خود پرست افراد نے فلسطینیوں کی نمائندگی کا "شرف" حاصل کیا۔

---

(۶)

تمام مشکلات اور محدودیت کے باوجود، میں نے شور مچایا کہ پی۔ ایل۔ او کی شاخوں میں نمائندگی کے معاملے میں خود فلسطینی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں مگر "الجاہرہ" میں کوئی شاخ قائم نہ ہو سکی کہ عوام شکوک میں مبتلا تھے۔ میں نے ان کا شک دور کرنے کی بہت کوشش کیں۔ مگر آخر مجھے ہی خود سمجھانا پڑا کہ پی۔ ایل۔ او کچھ بھی نہیں کہ کویت کی حکومت نے اسے فلسطینیوں کی سرکاری نمائندگی کا ادارہ سمجھا ہوا تھا۔ اور اس میں فلسطینیوں کی شمولیت کی اجازت اس شرط پر تھی کہ وہ لوگ کویتی سیاست میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں دیں گے۔

میرے کالج میں فلسطینیوں کا کلب بنانے کا تحریری حکم نامہ وصول نہ ہونے کی بنا پر میری پرنسپل نے پابندی کی شرط برقرار رکھی اور مجھے بلا کر تمام سرگرمیاں بند کرنے کو کہا، اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں لبنانی ہوں۔ لبنانی شہریت اور پاسپورٹ رکھتی ہوں۔ اس لیے میرا ویسے بھی فلسطینی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ میں نے پرنسپل کی یہ بات خاموشی سے سُنی۔ جس لمحے اس نے بات ختم کی، میں کھڑی ہو گئی "اے خاتون پرنسپل! تم جیسے حکم بردار، بزدل اور سیاست سے بے بہرہ لوگ ہی تو

فلسطین کے چھن جانے کے ذمہ دار ہو، تم جیسے سرکاری حاشیہ برداروں نے صیہونیوں سے زیادہ فلسطینیوں پر جبر و ستم کئے ہیں۔ تمہارے اس قبرستان جیسے سکول میں ذہانت پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن ہو جاتی ہے۔ تم دشمن کے کیمپ کی فرد معلوم دیتی ہو۔ مجھے یقین ہے اگر تم اپنے آقاؤں کو سر سے نہیں اتار پھینکو گی تو عالم عرب اور بھی زیادہ ظلم و استبداد اور تباہی سے دو چار ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم تسلیم شدہ دشمن سے بھی زیادہ خطرناک ہو۔ فرض کرلو، میں ہی یہاں اکیلی لبنانی شہری ہوں۔ کیا میری یہ شہریت مجھے عرب ہونے، عربی شناخت اور عربی عورت ہونے سے روک سکے گی؟ پرنسپل صاحبہ! میں ایک عرب فلسطینی اور لبنانی عرب خاتون ہوں اور عرب مؤقف کو تمہارے کیمپوں کے ارد گرد پھیلانا میرا فرض ہے۔ مجھے سوائے موت کے اور کوئی نہیں روک سکتا۔ خدا حافظ ــــــ!"

میں نے یہ کہہ کر باہر نکل کر زور سے دروازہ بند کیا۔ یہ اس کے دفتر میں میری آخری حاضری تھی۔

---

(۷)

۲۸ مئی ۱۹۶۴ء کو شاہ حسین نے یروشلم میں فلسطینی قومی کانگرس کا افتتاح کیا۔ اس کے ۳۵۰ ممبروں میں فلسطینیوں کے مختلف طبقوں کے نمائندے خاص کر دیہاتی اور رجعت پسند طبقوں کی اکثریت تھی۔ خاصے تیز انقلابی افراد کو اردنی حکام نے کانگرس میں جانے سے روک دیا تھا۔ کانگرس نے سات رکنی ایگزیکٹو کمیٹی بنالی۔ احمد شکیری کو دوبارہ چیئرمین تسلیم کر لیا۔ ایک مینی فیسٹو جاری کیا گیا، جسے نیشنل چارٹر کا نام دیا گیا۔ جس میں طبقۂ امراء کی کھوکھلی نظریاتی اخلاقیات، بلند آہنگ نعرے کہ جن سے آنے والا انقلاب عبارت ہوگا، بیان کئے گئے۔ پی۔ ایل۔ او نے قاہرہ میں عرب لیگ ہیڈ کوارٹرز میں فلسطینی سیٹ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۹۶۴ء کے موسم خزاں تک عرب سربراہوں کی یہ حاکمیت چلتی رہی۔ ایک سال کے اندر اندر خود ساختہ رہنماؤں کو اپنی ہی دروغ گوئی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ ہر چند ان کے ذرائع ابلاغ کے منصوبوں کو لفظوں کے چاندی اور سونے کے دالانوں میں لپیٹ کر پیش کرتے رہے تھے۔

---

(۸)

جون ۱۹۶۴ء میں مَیں لبنان واپس آگئی ۔ لبنان میں خفیہ سرگرمیوں میں شامل ہو کر میں نے کویت کی بے پناہ گرمی اور الجاہرہ کی تنہائی کی کھرنڈ کو اتارا۔ میں نے دیکھا کہ اے۔ این۔ ایم بیروت کی بنیادی ساخت میں دراڑیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ہر چند اتحاد میں اچھے مدبر اور اچھے ذاتی دوست ہونے کے ناطے اختلافات باہر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ نظریات، منصوبہ اور طریق کار، تنظیم اور شخصیات کے بارے میں سنجیدہ اختلافات بار بار ابھر کر سامنے آتے۔ حتیٰ کہ اگلے پانچ سالوں میں واقعی تبدیلی کا منظر نامہ ابھرا۔

موسم خزاں آیا تو میں نے کویت واپس جانے کا پروگرام بنایا۔ اب مجھے پھر اپنے بھائی کے ساتھ نہیں بلکہ بیرکوں میں رہنا تھا۔ کویت میں ایک خاتون کا تنہا رہنا، یہ تصور بھی دشوار تھا۔ اب میرا تبادلہ بھی ہو گیا تھا۔ مجھے شعب سکول جانا تھا۔ میری تنزلی بھی ہوئی تھی کہ مجھے سینئر سکول سے جونیئر سکول میں بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے دوسرے گریڈ کے بچوں کو اگلے پانچ برس تک پڑھانا پڑا اور یوں مجھے نوجوان ذہنوں کی تربیت سے محروم کر دیا گیا کہ ان کے خیال میں مَیں کلاس روم کو بھی سیاسی سطح پر لے آتی تھی۔ اب

میں کیا کر سکتی تھی۔ استعفیٰ اور بھی غلط قدم تھا کہ بے شمار بیکار عرب کارکنوں میں ایک اور کارکن کا اضافہ ہو جاتا۔

میرے شاگرد بہت مزے کے تھے۔ بہت سے تو ایرانی نژاد تھے۔ ان کے والدین کام کی تلاش میں کویت آگئے تھے۔ شعب سکول میں کارکنوں کے بچے پڑھتے تھے۔ بچوں کو اپنا کام کرنے کا شوق تھا۔ وہ ذہین بچے تھے اگر انہیں موقع ملتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اونٹنی کے بچے کو بھی ریس میں پیچھے چھوڑ جاتے ۔ ان کے ساتھ رہ کر اور ان کو پڑھا کر مزا آتا تھا۔ مگر سیاسی طور پر وہ بھی ابھی بے کار تھے۔ ایک دفعہ میں نے کلاس روم میں غیر جذباتی طور پر کچھ کہا۔ پرنسپل دیکھ رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ سات یا آٹھ سال کی عمر کے بچوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا کون سا طریقہ استعمال کیا جائے کہ وہ جواب بھی دے سکیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چند بنیادی باتیں فلسطین کے بارے میں انہیں بتا دی جائیں۔ مثلاً بالفور اعلامیہ، فلسطین کی تقسیم اور صیہونی اسرائیل کے قیام کا مسئلہ۔ فیکلٹی کی سطح پر کوئی سیاسی کشیدگی یا پرنسپل اور سٹاف کے ساتھ چپقلش نہیں تھی۔ ۱۹۶۸ء میں پرنسپل اور بیشتر اساتذہ نے فتح کی حمایت کی تھی۔ جو لوگ پاپولر فرنٹ کی حمایت کرتے تھے وہ بآسانی رہ سکتے تھے۔ ہر چند ماحول گفتگو کے لیے سازگار تھا۔ اور سیاسی ماحول گراں نہیں تھا۔ میں نے اپنی سیاسی حیثیت کو یہاں بھی پوشیدہ رکھا۔ اب مجھے استاد بننے کے لوازم بھی آگئے تھے اس لیے انتظامیہ سے لڑائی میں بھی کمی آگئی تھی۔

"الجاہرہ" کے مقابلے میں کویت بین الاقوامی شہر تھا۔ ہم گاؤں میں پابند نہیں تھے۔ میں ہفتے کے ہفتے اپنے بھائی اور اس کی بیوی بچوں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ محمد کے گھر جا کر میں اے۔ این۔ ایم کے لوگوں سے رابطہ قائم کرتی تھی۔ موومنٹ اس وقت سخت بدانتظامی کا شکار تھی۔ ہم یہاں بیروت کی گھا گھمی کے مقابلے

میں ہم یہاں تہذیبی طور پر پُرسکون ماحول میں تھے۔ لوگ بڑے دھیمے مزاج کے تھے اور دائیں بازو کی سیاست بھی موجود نہ تھی۔ یہ زمانہ میرے لیے عقلی طور پر سیکھنے اور اثر انداز ہونے کا تھا نہ کہ ٹھہراؤ کے شکار ہونے کا۔ میرے زیادہ تر ساتھیوں کا طریقِ زندگی عیش اور لطف تھا اور لطف بھی زیادہ کھانے سے حاصل کرنا۔ کچھ لوگ اپنی زیادہ تنخواہ والدین کو بھیج دیتے تھے اور رُوکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ میں سیاسی طور پر آگاہ تھی۔ سگرٹ بھی بلا کی پیتی تھی۔ مجھے کسی اور راہِ فرار کی ضرورت نہ تھی۔

---

(۹)

یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو جدید فلسطین کی تاریخ میں "فتح" نے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ یہ تاریخ، جدید فلسطینی انقلاب کی پیدائش کی تاریخ قرار پاتی ہے۔ مسلح جدوجہد انفرادی اور اجتماعی تعلیم و تربیت کی کوششیں۔ یہ سب باتیں مجتمع ہوکر سرزمینِ وطن کی آزادی کے لیے قابلِ ذکر باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ ہر چند کہ ۔ این ایم ۱۹۵۳ء سے خفیہ سرگرمیوں میں مصروف تھی اور فدائین کمانڈو مقبوضہ فلسطین میں ۱۹۵۵ء سے مسلسل بھیجے جا رہے تھے۔ فدائین کی سرگرمیوں کا سنہری زمانہ تو ۱۹۵۰ء کے وسط کا ہے۔ جبکہ مقبوضہ علاقے میں فدائین آزادی اور حوصلے کے ساتھ گھومتے بھی تھے۔ ہر چند کمانڈو کی تربیت کے مالی معاملات مصری حکومت برداشت کر رہی تھی۔ تمام شعبوں کا انتظام فلسطینیوں کے سپرد ہی تھا جو تمام شہروں اور دیہاتوں کی تفاصیل سے آگاہ تھے۔ کمانڈوز کا دھاوا، اتنا اچانک ہوتا تھا کہ اسرائیلیوں نے ان حملوں کو بطور جواز پیش کر کے برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں سے مدد حاصل کی تاکہ نہر سوئیز کے مسئلے پر اپنا دفاع کر سکیں۔ ۱۹۵۷ء میں مسئلے کا حل اور مصر سے غیر ملکی فوجوں کے انخلا کے بعد، ناصر نے گوریلا سرگرمیوں پر پابندی

عائد کر دی اور تقریباً گیارہ سال تک اسرائیل اور مصر کی سرحدوں پر کوئی گولی چلنے کا واقعہ نہیں ہوا۔ مصر نے اقوامِ متحدہ کی پناہ میں غازہ کے علاقے کا انتظام سنبھالا اور عرب ریاستیں آگے دس سال تک اسرائیل کی پہریداری کر رہیں۔ ان ممالک نے بھی گوریلا سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی۔

۱۹۶۴ء کے موسمِ خزاں میں پھر سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ پی۔ ایل۔ او کسی مرض کی دوا نہ بنی۔ عرب رہنما اپنے اپنے آزادی کے منصوبوں پر الگ الگ عمل پیرا ہوئے یو۔ اے۔ آر اور امریکی تعلقات بھی خراب ہو رہے تھے اور صدر جانسن دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہ مصر کو گندم کی فروخت کم کر دیں گے۔ شامی باتھسٹ یو۔ اے۔ آر اور عراق کے محاصرے میں خود کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، جن پر ناصر نے بُرا منایا۔ فلسطینی لوگ عرب بھائیوں سے سخت بددل ہوئے ان تمام وجوہات کی بنا پر فلسطینیوں میں آپس میں نئے رجحانات اور پالیسیاں بننی شروع ہوئیں اور کچھ کرنے کا ماحول بنتا محسوس ہوا۔ عربوں کے نمائندہ رہنما ناصر کو امریکہ کے ساتھ کافی ذہنی دشواریاں پیش آ رہی تھیں اس لیے وہ جارحیت کی حمایت کر گیا کہ اسرائیل پر بوجھ پڑے تا آنکہ امریکہ سے سودے بازی ہو سکے۔ ناصر کو اپنے حق میں طاقت کا توازن رکھنا بہرحال آتا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ناصر نے "فتح" کے فروغ کے بارے میں سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ پچاسویں دہائی کے وسط کے فدائین موومنٹ کی نقل پی۔ ایل۔ او ہوگی۔ نیا گروپ جو ابھر رہا تھا وہ پی۔ ایل۔ او کو بھی مات کر رہا تھا اور عرب لیگ کے کنٹرول میں بھی نہیں تھا۔ اس تحریک کے رہنما نوجوان جوشیلے، فتح کے ممبر اور انقلابیوں کی نسل تھے یہ آزاد گروپ تھا، کہ جن کا کسی عرب حکومت سے مالی منفعت کے لیے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ انہوں نے آزاد فلسطین

اور فلسطینیوں کے حقِ خود ارادی کی بھی بات کی۔ پہلے پہل تو فتح کو نظر انداز کیا گیا پھر اسے سنٹو کا ایجنٹ کہا گیا اور پھر دائیں بازو کی مسلم برادرہڈ کی خفیہ سرگرمی قرار دیا گیا۔

اب یہ تھا کہ فتح پر جس قدر الزامات لگائے جاتے، اتنی ہی فتح مقبول ہوتی جاتی جتنے فتح کے رضا کار مارے جاتے، اتنے ہی نئے رضا کار بھرتی ہو جاتے۔ جتنی افسرانہ اور امراء کی نمائندہ پی۔ ایل۔ او ہوتی گئی۔ اتنی ہی مسلح جدوجہد تیزی اختیار کرتی گئی کہ یہی امید کی کرن رہ گئی تھی۔ مجھے فلسطینی کی حیثیت سے، انسانیت کی ترجمان صرف بندوق نظر آتی تھی کہ جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو آزاد کرانے میں مددگار تھی۔ ہر صاحبِ عزت فلسطینی کو انقلابی بننا پڑا تھا۔

انقلابی سرگرمیوں کی خبریں کچھ زبانی اور کچھ اخباروں کے ذریعے کویت میں بھی پہنچیں۔ عراقی، مصری اور اردنی اخبارات، فتح اور انقلابیوں کی خبریں طنزیہ عنوانات مثلاً "دائیں بازو کے انتہا پسند" کے نام سے شائع کرتے، جو ان خبروں کو عارف ہیکل حسین کے انداز سے نہیں دیکھتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں یو۔ اے۔ آر کو امریکی گندم کی فروخت بند ہونے پر، صدر ناصر نے فتح پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ خاص کر جب حسین نے تمام پی۔ ایل۔ او کی کوششوں کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی اور اپنی اردنی سرحدوں کے قریب فلسطینی فوجِ آزادی منظم کرنے سے منع کیا تھا۔

عرب رہنما مشترکہ اجلاس سے منحرف ہونا شروع ہوئے اور اب ایک دوسرے پر الزام تراشی کی قرار دادیں پاس ہونا شروع ہوئیں۔ ناصر، فتح کی اس کے مقاصد کے باعث معاونت کرتا تھا۔ اس طرح ناصر نے عرب دنیا کو دو دھڑوں میں تقسیم کرا دیا تھا۔ ترقی پسند عرب دنیا۔ رجعت پسند عرب دنیا۔ اپنے آپ کو ترقی پسند عرب دنیا کا

رہنما سمجھتا تھا۔ سعودیوں نے واشنگٹن کے کہنے پر اسلام کے مقاصد کو کمیونزم کی لعنت کے مقابل فروغ دینے کا منصوبہ بنایا۔ شاہ فیصل "اسلامی پیکٹ" کے سرکردہ رہنما ٹھہرے اور منصوبہ تھا کہ تمام اسلامی ملکوں کو مربوط کرکے واشنگٹن سے منسلک کیا جائے۔ یمن کی سول وار موسمِ خزاں ۱۹۶۷ء میں ختم ہوگئی۔ یمنی انتہاپسندوں کو خرطوم پر ختم کر دیا گیا اور اس قربانی کو نام دیا گیا عرب اتحاد کا، مالی اعانت کا جو کہ تیل کے بادشاہوں نے ناصر اور حسین کے لیے کی۔ مصر کی پچاس ہزار فوجوں کو واپس بلا لیا گیا اور یمن کو رجعت پسندوں کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا گیا۔

فلسطین کے لوگوں نے جلاوطنی کے ۱۷ سال، عرب رہنماؤں پہ امیدیں رکھتے ہوئے گزارے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی آزادی کے لیے خدا پر بھروسہ کئے بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ کیا جائے۔ بہت سی خامیوں اور نقائص کے باوجود "فتح" ہماری زندگیوں میں اہم مقام حاصل کرنے لگی کہ اس وقت باقی ساری تنظیمیں جنگ کا فلسفہ سمجھاتی تھیں۔ جبکہ یہ تنظیم جنگ کرنے کی تیاریوں میں عملی یقین رکھتی تھی۔ اس کو فلسطینیوں نے مسلح جدوجہد کے لیے تخلیق کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ جدوجہد شروع بھی کی۔ میں بہرحال ابھی تیار نہیں تھی۔

---

(۱۰)

۱۹۶۵ء میں میری سیاسی دلچسپیاں کافی وسیع ہوگئیں۔ ٹیکساس کے کاؤ بوائے لنڈن جانسن کے باعث تو مجھے ویٹ نام اور لاطینی امریکہ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ الجزائری عوام کے بعد، ویٹ نام کی جدوجہد میرے لیے بہت بڑی قوت رکھتی تھی۔ ایک چھوٹی پستہ قد قوم، کالے پاجامے پہنے دنیا کی سب سے قوی ہیکل قوت امریکہ سے لڑ رہی تھی اور اُسے شکست دے رہی تھی۔ جانسن نے بمباری اور بھی زیادہ کروائی اور اس کے جرنیلوں نے جانسن کو فتح کی توقع دلائی اور اگر مزید بم، ویٹ نام کے علاقے میں پھینکے جائیں تو اور بھی زیادہ۔ اس بربریت اور انسانیت سوز "دیے" پر کچھ نہ کر سکنے کے باعث، غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ ویٹ نام کے لوگ بی ۵۲ بموں کے سامنے اپنی سرزمین کے تحفظ کے لیے ڈٹے رہے۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جو اپنی بے مثال قوتِ دفاع کے باعث خداؤں میں شمار ہو سکتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جو اپنی انسانیت طلبی کے لیے ساری دنیا میں اور رہتی دنیا تک انسان کو مقام دلانے کے لیے لڑنے والوں کے لیے مینارۂ نور بنے تھے۔ فلسطینیوں کو بھی ویٹ نامیوں کے انداز اپنانے ہوں گے۔

مقصد کے لیے جاں سپردگی، سرزمین کے لیے قربانی کا جذبہ، برادری کے لیے قطعی نفیٔ ذات اور پھر سیاسی طور پر ایک ایسی سیاسی پارٹی کا وجود کہ جو نظریاتی تنظیمی اور دفاعی طور پر واضح نقطۂ نظر کی حامل ہو۔ ہمیں ایسا کرنا ہوگا، کرنا ہے ورنہ پھر "مہاجر" کا لفظ تو ہماری تقدیر بن ہی چکا ہے۔

مجھے امریکی حکومت سے نفرت تھی۔ یہ نفرت اور بڑھی جب اپریل ۱۹۶۵ء کوئیں نے سٹیونسن کو ڈومینیکن ری پبلک پر حملے کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے آئزن ہاور کے زمانے کے اس لبرل ہیرو کو یہ بات کہتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ وہ کرنل فرانسسکو کمانوی انسر جنٹ آرمی کے "ساون کمیونسٹوں" کے الزامات سنا رہا تھا۔ ۲۰ ہزار امریکی فوجی سانتو ڈومنگو روانہ کئے گئے تھے کہ امریکیوں کی زندگی اور ملکیت کا تحفظ کرسکیں۔ یہ بہانہ تھا انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے کی سکیم کا۔ ہیں ہنستے ہنستے پاگل ہوگئی جب بی بی سی سے یہ نشریہ سنا کہ عیسائی سائنس مانیٹر نے ۷۵ کمیونسٹوں کو چیک کیا اور پتہ چلا کہ ان میں سے بیشتر یا تو فوت ہو چکے تھے یا جیل میں تھے یا جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ امریکی افواج نے جزیرے کو "آزاد" کرایا تھا اور "آزاد" انتخابات کرائے گئے، "نیک سیرت" لوگ منتخب ہوئے اور طبقۂ رؤسا کی حکومت مسٹر بلاگور کی سربراہی میں قائم کردی گئی۔ یہ سب کچھ "آزادی" کی حرمت کے لیے امریکہ کے خوابوں کی تعبیر کے لیے اور "اچھے معاشرے" کی تخلیق کے لیے کیا گیا۔

مجھے ویٹ نام اور ڈومینیگن ری پبلک پر حملے کا مطلب سمجھ میں آگیا۔ اب مجھے کوئی دن ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ جب امریکہ ہماری "آزادی کی حرمت" کے لیے ہمارے علاقے میں نہیں آنکلے گا کہ سویٹ یونین کے حملے اور توسیع پسندی کے خوف کا بہانہ اور دیتانت کے مطابق باہمی امن کی کوششیں، برازیل سے ویٹنام

تک، ڈومینیکن ری پبلک سے الجزائر تک، مالی سے انڈونیشیا تک اور یوگوسلاویہ سے یونان تک، تاریخ کے دھارے کو "صحت مند" رُخ کی جانب موڑنے کی تگ و دو کی داستان ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی واقعی امریکی دہائی تھی، ۱۹۷۰ء کی دہائی اس کی تنزلی کی داستان بنے گی[1]

---

[1] یہ بھی خیالِ خام نکلا۔

۱۱

۱۹۶۶ء میرے لیے ذاتی المیوں کا سال تھا۔ ابا چار سال کی طویل علالت کے باعث انتقال کر گئے۔ مجھے ان کے سائے سے محرومی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس موسمِ خزاں میں ہر سکول ٹیچر نے کالے کپڑے پہنے کہ ہر ایک کو المناک خبر سننی پڑی تھی۔ ہم سب ہی بہت غم زدہ تھے۔ میرے زخموں پر نمک پاشی اس طرح ہوئی کہ کویتی حکومت نے میرے بھائی کو سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر ملک بدر کر دیا۔ اسرائیل نے عوامی انتقام کی اکسانے والی چال چلی تھی۔

صیہونیوں کو ناصر کی کمزوریوں کا علم تھا۔ انہوں نے "فتح" کے مراکز پر حملہ کر کے دراصل عربوں کی طاقت کو آزمانا شروع کیا۔ مقبوضہ علاقوں پر گولہ باری کر کے اردنی علاقوں کو للکارا۔ نومبر میں اسرائیلیوں نے اسماؤ پر قاتلانہ حملہ کر کے اپنے خونی عزائم کا اعلان کیا۔ سارے شہر کو مسمار کیا اور درجنوں باشندوں کو قتل یا زخمی کر دیا۔ اس کے مقابلے میں عرب فوجی نقل و حرکت صفر تھی۔ عرب مشترکہ افواج کا ردِ عمل نفی میں تھا۔ ہاں اتنا کیا کہ عرب اقوامِ متحدہ تک گئے۔ امریکہ سے منظور کرا کے اسرائیل کے خلاف قرارداد پیش کی۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں ناصر کی شام کے ساتھ سیاسی وابستگی کا امتحان بھی ہو گیا۔ ۷، اپریل کو اسرائیلیوں نے شامی جٹ فائٹرز کو مار گرایا اور مصری مگ طیارے اپنے پروں کو چھپائے کھڑے رہے۔ اسرائیل کی جسارت کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے مئی میں ناصر کو چیلنج کیا اور وہ ان کے جال میں پھنس گیا۔ جون میں ایک ہفتہ کے اندر اندر مصری فوج زیرے کی طرح پیس دی گئی اور "مشرق کا جن" بوتل میں بند کر دیا گیا۔ عرب نیشنلزم کے غبارے کی ہوا ڈھائی گھنٹے میں نکل گئی۔

۵۔ جون ۱۹۶۷ء عربوں کی تاریخ کا سیاہ دن بنا۔ عرب اتحاد کا دھندلکا بھی نہیں بچا۔ ناصر تو کیا ناصرازم کا حرف حرف، موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اب سوائے جوابی حملے اور عرب کی فتح کے، مجھے تو کوئی اور راستہ قبول نہ تھا۔ مجھے یہ اعتماد ۹ جون ۱۹۶۷ کو ناصر کے استعفیٰ دینے کی خبر نے بخشا۔ میں نے اپنا ریڈیو توڑ ڈالا اور میں خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئی۔ میری ساری دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر عرب، غلام ہو گیا ہو۔ فلسطین جانے کے لیے تمام تیاریاں دفن ہو گئیں۔ میرا بیروت جانے کو بھی جی نہیں کرتا تھا۔ پھر مجبوراً فیصلہ کیا کہ آخر جا کر دیکھوں تو کہ قومیں مرتے مرتے کیا کرتی ہیں۔ میرے بھائی ولید نے اے۔ این ایم کے دائرہ کار میں سرگرمیوں کے بارے میں سمجھایا اور اسی سال موسمِ خزاں میں فلسطینی آزادی کا پاپولر فرنٹ وجود میں آگیا۔

۱۹۶۷ء کا موسمِ گرما بیکار گزرا۔ امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ میرا اعتماد اب ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کویت واپس آگئی۔ مغربی کنارے کے خاندان ہولناک کہانیاں سنا رہے تھے۔ صیہونیوں کی سفاکیوں اور بہیمانہ وارداتوں کی داستان، عصمت دری، قتل، چوری، کبھی ہوائی حملوں سے بموں سے مارنا۔ کبھی گھروں کو آگ لگا دینا۔ نیپام بم گرانا۔ گویا ہر قسم کی اذیت فلسطینیوں کا مقدر بن رہی تھی۔

طرح طرح کی کہانیاں ایسی کہانیاں کہ جن کو سن کر کلیجہ شق ہو جائے۔ مثلاً ایک ماں اپنے پیاسے بچے کی سوکھی زبان تر کرنے کے لیے اتنا روئی کہ بچے کی زبان تر ہو گئی۔ میں جس قدر ایسے واقعات سنتی، اسی قدر میرے اندر انتقام کا جوالا مکھی پھوٹ بہہ نکلتا۔ کہیں پورا شہر زمین میں دفن کرنے کا واقعہ سنائی دیتا تو کہیں پورا پورا شہر جلا دینے کی "جرأت" کا قصہ ہوتا تھا۔ ۲۲ نومبر کو یو۔ این سکیورٹی کونسل نے عربوں کی رضامندی سے اسرائیل کے فلسطین پر مکمل اور باقاعدہ قبضے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اسرائیل کو بین الاقوامی آبی گزرگاہوں کو استعمال کا حق بھی دیا اور سرحدوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تسلیمیّت کو مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے سے مشروط کر کے عربوں اور فلسطینی عوام کی دلداری کی۔

میری ناامیدیوں میں اور اضافہ ہوا کہ ۹ اکتوبر کو میرے ہیرو چے گویرا کو سی آئی اے نے قتل کرا دیا۔ جون کی جنگ نے میرے اعصاب کو شل کیا تھا، چے گویرا کے قتل نے میرے ضمیر کو زخمی کر دیا۔ یہ ایک ارجنٹینی انتہا پسند تھا جو کیوبا کے فیڈرل کاسترو کے ساتھ جدوجہد میں شریک تھا اور جس کے باعث یکم جنوری ۱۹۵۹ء کو انقلاب قوت حاصل کر سکا تھا۔ اگلے آٹھ سالوں میں چے گویرا کا مرتبہ بین الاقوامی حیثیت کا ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت بھی کاسترو جیسی تھی۔ جب کاسترو اور چے میں اختلافات ہوئے تو چے نے وزیرِ صنعت کی حیثیت سے استعفیٰ دے کر علیحدگی اختیار کر لی تھی اور خاموش ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کیوبا کے انقلاب کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنے اور کاسترو کے اختلافات کو مشتہر کر سکتا تھا۔ اس نے افریقی ملکوں کا دورہ کیا۔ الجزائر کے بن بیلا سے اس کی دوستی ہوئی۔ اس نے کانگرس میں یورپی کرائے کے فوجیوں اور شومبے کے علیحدگی پسندوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ کانگو میں سویٹ اثر کے باعث اسے کوکامیابی حاصل ہوئی۔ پھر وہ ۱۶ گوریلوں کے جتھے کے

ساتھ بولیویا گیا۔ گیارہ ماہ تک وہ انقلابی محاذ بنانے اور رینے برینٹو کی ڈکٹیٹرشپ ختم کرانے کے لیے مصروفِ عمل رہا۔ اکیلا فرد امریکہ جیسی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا۔ آخر کو وہی ہوا۔ امریکہ نے 'لنڈن جانسن نے' ہم عصر نے، چے کو قتل کروا دیا۔

میرے لوگوں کو بھی فلسطین کی سرزمین واپس لینے کے لیے "چے" جیسے رہنماؤں کی ضرورت تھی۔

دوسرا حصّہ

نئی انسانیت کا اعلامیہ

مزاحمت اور انقلاب

شاہراہ حیفا —

حیفا پر صیہونیوں نے قبضہ کر کے اُسے یورپی شہر بنا ڈالا تھا۔ یورپی تہذیب اور غیر انسانی رویوں کا آئینہ، حیفا کو موشے دایان سے واپس لینے کے لیے صرف دعائیں کافی نہیں ہوں گی۔ حیفا کو حاصل صرف ایک نئے فلسطین کی پیدائش کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے جس میں یہودی اور عرب دونوں موجود ہوں۔

— ابو سلام

(۱)

عرب عوام نے دس سال تک ناصر زم کو عرب اور فلسطینی عوام کی آزادی کا سمبل بنائے رکھا تھا۔ وہ چراغ بھی اب گل ہو چکا تھا۔ موشے دایان اپنے دفتر میں بیٹھا ناصر کے فون کا منتظر تھا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ معاہدۂ امن پر دستخط کرنے کے لئے کب کہتا ہے۔ البتہ سامراجی قوتوں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ناصر نے موشے دایان کو فون کیوں نہیں کیا کہ وہ جانتا تھا کہ مصر کے لوگ اسے زندہ جلا دیتے۔ کوئی بھی رجعت پسند عرب رہنما، آج بھی جرأت نہیں کر سکتا کہ موشے دایان سے صلح کرنے کا عوامی سطح پر اعلان کرے۔ فلسطینی عوام نے البتہ موشے دایان کے امن پلان کا جواب دن کی روشنی میں بمباری کر کے دیا کہ ان کو باور آیا تھا کہ مصری، امریکی، اسرائیلی، روسی گولاسٹ اور برطانوی سب اقوام، امن کا راگ الاپ رہی ہیں اور فلسطینیوں کو پامال کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ جون کی جنگ میں تو بالکل یوں

لگ رہا تھا کہ جیسے امریکہ اور روس کی باہمی مفاہمت کے بعد ہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیسٹر ویلی نے اس بارے میں لکھا ہے:۔

"تین سال اور نو ماہ۔ کریملن اور وہائٹ ہاؤس کے درمیان رابطہ صرف مبارکبادیوں کے پیغامات تک محدود رہا۔ ۵ جون ۶۷ء کو پہلی دفعہ ماسکو سے سخت پیغام کیا۔ مگر یقین دہانی کے ماحول میں سوویٹ یونین نے بھی کہا کہ اگر امریکہ دخل نہ دے تو سوویٹ یونین بھی مشرقِ وسطیٰ پہ ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ جانسن نے بھی محتاط الفاظ میں اس وعدے کا اعادہ کیا۔"

جانسن کو سی آئی اے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ اسرائیل تین چار دن میں جیت جائے گا۔ اگر یہ اندازہ غلط ہو جاتا تو امریکہ دخل اندازی کرتا۔

۱۹ جون ۱۹۶۷ء کو کوسیگن کی سربراہی میں ایک وفد یو۔ این گیا۔ جہاں مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل کو جارح قرار دیا جائے۔ کہا جائے کہ اس کی فوجیں ۴ جون والی پوزیشن پر واپس چلی جائیں اور اسرائیلی نقصانات کا ازالہ کرے۔ کوسیگن کی تقریر سے صرف ایک گھنٹہ پہلے جانسن نے خارجہ پالیسی کانفرنس کے ماہرین کے سامنے امن کی پانچ نکاتی منصوبہ پیش کیا۔ جس میں اس علاقے میں تمام اقوام کو باعزت زندگی اور آزادی کی ضمانت، مہاجرین کے ساتھ انصاف، بحری قوانین کا احترام، سیاسی آزادی کی عزت اور علاقائی آزادی کی امن کے ساتھ ضمانت۔

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو بات کوسیگن کہنا چاہ رہا تھا وہی جانسن نے کہی یو این کے ہر اجلاس میں یہ واضح ہوتا تھا کہ:

(۱) تمام نمائندگان، فلسطینیوں کو مہاجرین کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہیں۔

(۲) وہ عرب ممالک اور یہودی ریاست کا جھگڑا بنا کر پیش کرتے تھے حالانکہ یہ تو عرب مقابل صیہونیت یا ظالم بمقابل مظلوم کا تضاد تھا۔

(۳) سب نمائندوں نے ایک نئے سماج کی تعمیر کے بجائے موجود ڈھانچوں کو بہتر کرنے کی بات چیت کی۔

یو۔این۔ قراردادیں پاس کرتی رہی۔ سیز فائر بھی ہو گیا۔ یو۔این نے فوجوں کی واپسی کی بھی کوئی قرارداد پاس نہ کی۔ بس مبصّرین کی تعیناتی کی منظوری دی۔ سویٹ اور امریکی اپنے اپنے مدار میں واپس چلے گئے۔ عرب ڈپلومیٹ فاتح کی طرح اسرائیلی فوجوں کی واپسی کے کھوکھلے نعرے مار رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں کویت واپس آگئی۔ اور اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ جو لوگ عرب ممالک ہو کے آئے تھے وہ تو سخت مایوسی کا شکار تھے۔ جو مقبوضہ علاقے دیکھ کر آئے تھے۔ وہ مسلح جدوجہد کے حق میں تھے۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ ساتھ "فتح" میں نئے خون۔ اور نئی انتظامی تبدیلیوں کی خبر آتی رہی۔ نومبر میں پاپولر فرنٹ کا قیام عمل میں آگیا۔

میں گرمیوں میں لبنان میں تھی۔ میں سور میں مقیم اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے پی۔ایف۔ایل۔پی کی سرگرمیوں کی واقعیت پرکھنے کا کوئی پیمانہ میرے پاس نہ تھا۔ اس لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ "فتح" کی سرگرمیوں میں حصّہ لیا جائے۔ ابھی ایک سال تو ہمیں نوجوانوں کو یہ سمجھاتے گزرا کہ ناصر کیوں فیل ہوا۔

اور عالمِ عرب کی مدافعت کیوں نہ کر سکا۔

کویت میں "فتح" کی سرگرمیوں کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ پی۔ایل۔او کو سرکاری سطح پر فلسطینی عوام کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا مگر کویت میں نہ ان کے کوئی لیڈر تھے اور نہ حمایتی۔ میں بھی نہ حمایتی تھی، نہ مخالف۔ "فتح" نے چونکہ ۱۸ اگست، ۱۹۶۷ء کو ملٹری آپریشن پھر شروع کیا تھا۔ میں نے اپنے اساتذہ اور پرنسپل کے ساتھ فتح کے لئے کام کرنے اور فلسطین کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کا عزم کیا۔ ہم جو قدم بھی اٹھاتے جو کام بھی کرتے اور جس خیال کو بھی پیش کرتے۔ اے۔این۔ایم اس کا شعوری اور منطقی جواز پیش کرتی تھی۔ "فتح" میرے لئے ایک نیا تجربہ تھی۔ اب تک ہماری بنیادی ذمہ داری فقط چندہ جمع کرنا تھا۔ کبھی کبھی مبہم قسم کے لیکچر بھی دیے۔ ہم "فتح" کے گنبد میں صرف تماشائی تھے، نظریہ یا پالیسی ساز نہیں تھے۔ جتنے مقرر تھے وہ بھی بین بین بات کرتے اور معومنٹ میں شامل ہونے کے بس اصول ہی بتاتے۔

پہلے پہل میں نے سوچا کہ اتنے سوالات پوچھنے غلط بات تھی۔ پھر میں نے خود کو یقین دلایا کہ اگر فلسطینی کو نہیں معلوم ہوگا کہ وہ فلسطین کے لئے کیا کر رہا ہے تو اور کسے معلوم ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے اور زیادہ شدّومد سے سوال کرنے لگی۔ مثال کے طور پر "فتح" کے معاشی اور سماجی مقاصد اور طریق کار کیا ہیں اور ہوں گے؟

ہم نے سعودی عرب اور دوسرے رجعت پسند ممالک سے

امدادی رقم کیوں لی ہے؟ موومنٹ کس کے آگے جواب دہ ہے؟ "فتح" عرب سے کٹی کٹی کیوں ہے؟ پھر اہم سوال جو میں پوچھنا چاہتی تھی کہ "فتح" میں عورتوں کا کردار، فنڈ اکٹھا کرنے کے علاوہ بھی ہوگا؟

ہمیں جواباً بتایا گیا کہ موومنٹ خود مختار ہے۔ البتہ اس کے رہنماؤں کو حفاظتی نقطۂ نظر سے نامعلوم رہنا چاہیئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ "فتح" کا ہر راز سب کو معلوم ہوتا تھا اور اس کے تمام رہنماؤں کے نام ساری دنیا کو معلوم تھے۔ عمان میں تو ہر دوست اور دشمن کے سامنے موومنٹ کا منصوبہ اور لائحہ عمل پیش کیا جاتا تھا۔ سعودی عرب کے بارے میں کہا گیا کہ آغاز میں آپ کو دشمنوں کو بھی اپنا معاون اور حامی بنانا پڑتا ہے۔ آغاز میں صرف فلسطینی رضاکار بھرتی کئے جاتے تھے۔ پھر عربوں پر سے یہ پابندی ہٹا دی گئی۔ میرا کمشنر مجھ سے پوچھتا تھا تم اتنے سوال کیوں کرتی ہو اتنی مشکلیں کیوں پیدا کرتی ہو اور میں کہتی: ابو علی! ہم اس وقت تک نہیں جیت سکتے جب تک واضح پروگرام اور منظم ممبر نہ رکھیں۔ علاوہ ازیں انقلاب کا نعرہ نہیں بلکہ حقیقت سمجھے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ میرے سوالات میرے سننے والوں کو دلچسپ اور اہم لگتے۔ ایکدن "فتح" کا ایک اہم رکن فتحی عرافات، یاسر عرفات کا بھائی مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اس سے بھی عورتوں کے "فتح" کے کردار کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے ملٹری کا شعبہ "العاصفہ" اختیار کرنے کا موقعہ دیا جائے کہ میں نے سالہا سال ملٹری کی تربیت

لی ہے۔ میں مقبوضہ علاقوں میں چھاپہ مار کی حیثیت سے اور آپریشن پر جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ حتی الامکان کوشش کرے گا اور مجھے ایک ماہ کے اندر جواب دے گا۔ ایک ماہ بعد فتحی نے مجھ سے پوچھا کیا میں اردن کی جانب دریائے اردن کے کنارے الاغوار کے علاقے میں جاسکوں گی۔ میں نے فوراً اثبات کی اور تیاریاں شروع کر دیں۔ پھر وہ یہ بتانے نہیں آیا کہ مجھے کہاں رپورٹ کرنا ہے۔ کیا۔ اپریشن کرنا ہے اور کہاں سے شروع کرنا ہے؟ اس دوران میرے ساتھی فتحین نے میرے لئے کام ڈھونڈا۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب کو ایک گروپ کی شکل میں ۱۹۶۸ء کے موسم گرما میں کچھ کرنا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ کیمپوں میں کام سے تھکی ہاری مہاجر ماؤں کی گھرداری میں مدد اور شہداء کے خاندانوں کی مدد اور دلبستگی؛ یہ سن کر میں نے چلّا کر کہا۔ "یہ معاشرتی انقلاب کی باتیں ہیں۔ میں انقلاب کے لئے کام کرنا چاہتی ہوں۔

میری ان باتوں کا جواب ۲۱ مارچ کو کرامہ کی جنگ کی صورت میں مل گیا۔

---

(۲)

دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر کرامہ واقع تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد بس فلسطینی ہی یہاں مقیم تھے۔ اور لگتا تھا کہ بس فلسطینیوں ہی کے لئے یہ بنایا گیا تھا اور ان کی امیدوں اور عزت کی آماجگاہ تھا۔ اسرائیلیوں نے کرامہ کا نام و نشان مٹانے کی کوشیش کیں۔ مگر انتہائی قوت آزمانے کے باوجود ناکام رہے۔ ہر چند فوجی تناظر میں ان کا پلڑا بھاری رہا۔ اب عرب شعبہ نشریات نے پلٹا کھایا اور اعلان کرنا شروع کیا کہ فلسطین کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا چاہتا تھا۔ ہزاروں رضاکاروں نے اپنے نام لکھوانے شروع کر دیئے سونا کلو کے حساب سے جمع ہوا۔ اور اسلحہ ٹنوں کے حساب سے اکٹھا ہوا۔ "فتح" جو چند نیم تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ وہ عربوں کو چین کے ۱۹۴۹ء کے انقلابیوں کی قوت نظر آنے لگی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ حسین نے بھی خود کو کمانڈو کہلانا شروع کر دیا۔ عرب فلسطینی عوام نے سمجھا کہ بس فلسطین واپس ملا کہ ملا۔

عرب حکومتوں نے فتح کو راکیٹس، آرٹلری، ملٹری ٹرانسپورٹ وغیرہ مہیا کرنی شروع کی۔ دراصل عرب حکومتیں فتح کے سائے میں اپنی نامردی کو چھپانا چاہتی تھیں۔ "فتح" تو عوامی بولی، فیشن اور سرگرمی کا استعارہ بن گیا۔ اس کے لیڈر اور کارکن فرشتے اور مسیحا سمجھے جانے لگے۔ "فتح" یاسر عرافات کی سرکردگی میں پی۔ ایل۔ او کو قابو میں لانا چاہ رہی تھی۔ ابھی فتح اور پی۔ ایل۔ او میں رفاقت اور رقابت کا کھیل

جاری تھا کہ ادھر تین انقلابیوں نے انفرادی سطح پر ڈرامائی واقعہ کیا کہ جسے پی۔ ایل۔ او نے اپنی ذمہ داری نہیں مانا۔ فلسطین کی آزادی کے پاپولر فرنٹ یعنی پی۔ ایف۔ ایل۔ پی نے اسرائیل کا نیم فوجی اور نیم سویلین جہاز اغوا کر لیا۔ جہاز کو الجزائر لے جایا گیا۔ پھر بغیر کسی اصرار یا تبادلے کے جہاز اور مسافروں کو رہا کر دیا گیا۔ تمام عرب قوتوں اور فلسطینی محاذوں نے پی۔ ایف۔ ایل۔ پی کی مذمت اور مخالفت شروع کر دی اور اس واقعہ کو فضائی قزاقی بھی کہا گیا۔

یہ حادثہ میری زندگی کا رخ متعین کر گیا۔ میں نے فوراً پی۔ ایف۔ ایل۔ پی سے رابطہ قائم کیا۔ انہی زمانے میں والی ڈبلیو۔ سی۔ اے کی ایک امریکن لڑکی جین، ہارٹو، سوم میں ہمارے گھر ایک ہفتہ رہنے کو آئی۔ وہ ہمارے گھر اس لیے آئی کہ میری چھوٹی بہن خالدہ کا وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے سے رابطہ تھا۔ ہم لوگ زیادہ تر آپس میں انگریزی بولتے تھے۔ جین بالکل معصوم تھی وہ مہاجرین کو تیرنا، ٹھاٹنگ کرنا، کھیلنا اور لطف لینا اور اٹھانا، سکھانے آئی تھی۔ جین جس بھی جیس

میں آئی تھی، تھی تو امریکی۔ ہم نے اس کو امریکی اور صیہونی سامراجیت پر زور دار لیکچر دئے تو اس نے کہا کہ سیاست کا تجزیہ کرتے وقت جذباتی زبان اور بیان اپنے ہی خلاف چلے جاتا ہے۔ وہ خود کہتی تھی۔ کہ وہ سیاسی طور پر بہت آگاہ شخصیت نہ تھی۔ مگر ساتھ ہی اس نے "فتح" کو دہشت پسند گروپ کہا کہ جنہوں نے اسرائیلی بچوں کے راستوں پر بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ ہم جین کو اصل صورت حال بتاتے رہے۔ اس کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ تو صیہونی نظریہ ہمارے سامنے پیش کر رہی تھی۔ دراصل وہ کیتھولک لڑکی تھی اور اسے عرب اور یہودیوں کے لئے اسی طرح یکساں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ کیا تم آزاد فلسطین میں اس ماحول سے زیادہ آرام اور آسائش پا سکو گی۔ نہیں۔ مجھے نہیں چاہیئے یہ آرام۔ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ چاہیئے۔ کیوں نہیں چاہیئے۔ تم بعد میں افسوس کرو گی۔ جین نے آواز میں تحکم پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تم سب لوگ یونہی شور مچاتے رہو گے اور ایسے ہی ماحول میں رہنا پسند بھی کرو گے۔"

جین کا یہ فقرہ تو مجھے سُن کر گیا۔ اس کا کہنا ایک حد تک سچ تھا۔ ہم سب باتیں کرتے تھے۔ کام کرنے والا تو ہم میں سے ایک بھی نہ تھا۔ میرے بھائی کو جین پر بہت غصہ آرہا تھا اور وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارنے والا تھا۔ کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کہا امریکی لڑکی ہماری غلطیاں بتاتی ہے تو ناراض ہونے کی کونسی بات ہے۔ ہم صیہونیت کے خلاف جوابات تیار کرتے ہیں، گولیاں نہیں۔

میں نے پی۔ ایف۔ ایل۔ پی میں شمولیت کا ارادہ تو کر لیا تھا مگر راستہ اب بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن کویت میں میں جنوبی عربی بک سٹال سے گزری تو ایک شخص پی۔ ایف۔ ایل۔ پی کے کرسمس کارڈ بیچ رہا تھا۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ان کا ممبر تھا یا ہمدرد، میں اس کے پاس رُک گئی اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ میں پی۔ ایف۔ ایل۔ پی میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں فلسطینی ہوں ـــــ میں لڑنا چاہتی ہوں۔ میں مقبوضہ علاقے میں جانا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی میری مدد کیجئے۔

اس نے میری بات سنی اور جمعرات کو تین اور چار بجے کے درمیان آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ میں بہت خوش تھی۔ میں مقررہ وقت سے دو گھنٹہ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ کبھی کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھتی، کبھی کوئی۔ پورے تین بجے، لمبا خوبصورت جوان دکان میں داخل ہوا۔ میں سمجھ گئی۔ یہ پی۔ ایف کا آدمی تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ مجھے ملٹری ٹریننگ اور کام کا کس قدر شوق تھا۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا:
"پہلے تمہاری تعلیم ہونی ضروری ہے۔"

میں نے پھر جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔ "جی میں پوسٹ گریجوایٹ ہوں۔ سکول میں ٹیچر رہی ہوں۔ مجھے لکھنا اور بولنا آتا ہے۔"

"اوہو میرا مطلب لکھنے پڑھنے سے یہ نہیں ہے۔" نڈال، پی۔ ایف نمائندے نے کہا۔ تمہیں تو پی۔ ایف کے نظریۂ کار کردگی اور دوسرے

کارکنوں کے ساتھ کام کرنے کی تربیت لینی ہوگی۔ پھر ہم فیصلہ کرینگے کہ تمہارے اندر انقلاب کے لئے کام کرنے کی ہمت اور قوت ہے کہ نہیں۔ "میں ۔۔۔ میں لڑنا چاہتی ہوں"۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیلیٰ! فلسطین کی جنگ ایک لمبی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ تمہارے پاس بہت وقت ہوگا اپنی قوت اور صلاحیت کو ظاہر کرنے کا۔ یقین کرو۔ اگر تم لڑنے کے قابل ہو تو تمہیں اپنے جذبے کی عملی صداقت اور مہارت کے اظہار کا موقعہ ملے گا۔ یقین کرو۔ اگر تم میں لڑنے کی صلاحیت اور جذبہ ہے تو پی۔ایف تمہیں کہیں بھی بھیجنے میں تامل نہیں کرے گا۔"

میں یہ وعدہ سن کر نہال ہو گئی۔ میں پھر یقین دہانی چاہتی تھی کہ مجھے پھر درماندہ چھوڑ تو نہیں دیا جائے گا۔ مجھے اب کرنا کیا چاہیئے۔ ندال نے کہا۔ "پہلے تمہیں لفظ کے ذریعہ تعلیم کرنی ہے۔ لوگوں کے سٹڈی گروپ بنانے ہوں گے کہ تم خود کو اور دوسروں کو علم سکھا سکو۔ پھر پی۔ایف کی مالی امداد کے لئے مختلف منصوبوں پر کام کرنا ہوگا۔ اب ہم انشاءاللہ اگلے ہفتے یہیں ملیں گے اور یہاں سے آگے کے مسائل پر بحث کریں گے۔ اور اگر تم ہمیں ملنا بھول گئیں تو ہم خود تمہیں آکر ملیں گے۔

میں آج پہلے دن گھر مطمئن لوٹی۔ مجھے لگا جیسے میں شاہراہِ حیفا پر چلنے لگی ہوں۔ میں پاتال سے لوٹ رہی تھی۔

اسی شام میں نے اپنے چند دوستوں سے رابطہ قائم کیا۔ ہم نے ساری

رات سیاسی مسائل، وابستگی اور ہر استاد کی کومٹ منٹ کا جائزہ لیا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہمارے حمایتی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور ہم چند ہفتوں ہی میں ایک سیل قائم کرسکتے تھے۔

اب ہم ہر ہفتے ملتے اور میں پی ایف لٹریچر اور ہدایات لینے کے لئے ندال سے ملا کرتی۔ ابوندال نے میری ملاقات کچھ پرانے سابقہ اے۔این۔ایم کے کامریڈوں سے کروائی کہ ان لوگوں نے بھی پی ایف میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ ہم کویت میں پی ایف کا پورا ڈھانچہ بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ایل آل جہاز پر حملے نے تو ہمارے حوصلے بہت بلند کئے۔ خاص کر ۲۸ دسمبر کے واقعہ کے بعد کہ جب اسرائیلیوں نے بیروت ہوائی اڈے پر حملہ کرکے ۱۳ مڈل ایسٹ ایر لائنز کے جہاز تباہ کر دیئے گئے تھے۔ ہم خوش اس لئے ہوتے تھے کہ ان میں ۷۰ سے ۸۰ فیصد تک جہاز امریکہ کے تھے۔ اور یوں لبنان میں انقلاب کی روح وسیع تر ہونے کے امکانات روشن تھے۔ اب دنیا فلسطینیوں کے اقدامات کو قابلِ توجہ سمجھنے پہ مجبور تھی۔ عرب پریس اس سے صرفِ نظر نہ کرسکتی تھی۔ اور اسرائیلی اسے چھپا نہیں سکتے تھے۔ بلکہ اسرائیلیوں نے تماشے کو اور بھی پُرلطف بنا دیا تھا۔

---

(۳)

ہمارا سٹڈی گروپ پی۔ ایف کے نظریاتی اور تنظیمی ڈھانچے کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا۔ ابو ندال کے کہنے پر ہم مکمل سیاسی کتابیں پڑھ کر اپنا ذہنی افق روشن کر رہے تھے کہ جب کہ ایک اور فلسطینی خاتون نے دنیا کی شہ سرخیوں میں اپنا نام لکھا ہوا پایا۔

۱۸ فروری کی صبح میں پانچ بج کر ۳۵ منٹ پر اُٹھی کہ اپنا ناشتہ بناؤں اور بی بی سی کی خبریں سنوں۔ ایک دم میں نے امینہ دھبور کا نام سنا۔ اس نے زیورچ میں ال۔ آل جہاز کو اغوا کیا تھا۔ وہ پہلی خاتون تھی کہ جس نے غیر ملکی آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ یہ خبر مجھے بجلی کی چمک کی طرح محسوس ہوئی۔ ایک فلسطینی' انقلابی خاتون جو سرمایہ داری کے "تابوت میں کیل ٹھونک رہی تھی۔ خوش قسمتی سے بی۔ بی۔ سی اناؤنسرز شہ سرخیاں آخر میں پھر دہراتے ہیں۔ میں اسے خوش

قسمتی اس لئے کہہ رہی ہوں کہ پہلی دفعہ سن کر مجھے اعتبار بھی نہ آیا تھا اور نہ دوبارہ سن کر میں یقین کر لینا چاہتی تھی۔

میں نے یہ سنا تو میں رات کے پاجامے ہی میں دوڑتی ہوئی سارے ہاسٹل میں چیختی پھری۔ "اس نے کر لیا۔۔۔۔۔ اس نے کر لیا۔ اب فلسطین آزاد ہو جائے گا۔" ہر ایک نے میرا حلیہ اور میرا چیخنا سن کر محسوس کیا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ مگر مجھے یہ فخر ہو رہا تھا کہ میں نے ہر ایک تک یہ خبر پہنچا دی ہے۔ ہم کہ ادھر کویت میں ابھی باتیں ہی کر رہے تھے۔ ایک فلسطینی عورت کام کر رہی تھی۔ ہم سب نے تھوڑی ہی دیر بعد فلسطینی خاتون کے کارنامے اور فلسطینیوں کی جدوجہد کی کامیابی اور امینہ دھبور کی جاں سپاسی کا جشن منایا۔ "فتح" اور پی۔ ایف کی عورتوں نے مل کر فلسطینی رقص 'دبکے' کیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جتنا چندہ جمع ہے وہ "فتح" اور پی۔ ایف کے درمیان مساوی تقسیم کر دیا جائے۔ فتح سسٹرز خاموشی سے مان گئیں۔ سکول تو مزاحمت کے حوالے سے شہد کی مکھیوں کا چھتہ بن گیا تھا۔ حتّٰی کہ طلباء بھی ہمارے لئے چندہ جمع کرتے اور انقلابی فکر کو ہمارے ساتھ عام کرنے میں مدد کرتے۔

اسی دن میں کامریڈ ابو ندال کے پاس گئی اور کہا کہ میں تو سپیشل آپریشن سکوڈ میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔ وہ بھی راضی ہو گئے۔ اور اس دن سے میں خصوصی تربیت کے لئے جانے لگی۔ اب بس کوئی دن جاتا تھا کہ میں ملٹری آپریشن کے سلسلے میں روانہ ہوں۔ میں اپنی تربیت کے دوران سٹڈی گروپ کا کام بھی جاری رکھا اور اس

گروپ کو روایات توڑنے کی تربیت دینی شروع کی۔ کویت میں سیاست ممنوع تھی۔ مگر چھ عورتوں نے مزاحمت کے نام پر اپنے روزگار اور عزت کو خطرے میں ڈالنا قبول کیا۔ اپریل کی ایک صبح جسے ہم مسلمانوں کا ایسٹر کہتے ہیں۔ ہم کویت کے سب سے مصروف علاقے میں پی۔ ایف چندہ جمع کرنے کے ڈبے اُٹھائے اور چندہ جمع کرنے کی اپیل کرنے کیلئے نکلے شروع شروع میں دیگر خواتین بہت جوشیلی نہیں تھیں۔ مجھے نہ شرم آرہی تھی اور نہ خوف کہ میرے لئے تو فقط انقلاب کا نام کافی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ ہماری سوچ سے زیادہ مددگار اور ترقی پسند تھے۔ انہوں نے نہ صرف فیاضی سے ہماری مدد کی بلکہ دوسروں کو بھی مدد کرنے پر مجبور کیا۔ اور سارے شہر میں اپنی ہمدردیوں اور تعاون کا جال بچھا دیا۔ عورتوں نے بھی آگے بڑھ کر مدد کی۔ عوام نے ہمارے ڈبے بھر دیے۔ حتّٰی کہ سرکاری اہل کاروں نے ہماری سرگرمی پہ اعتراض نہیں کیا، پورے کا پورا شہر آگے آنے کو تیار نظر آیا۔

یہ حوصلہ افزائی دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ رقم انگریزی پڑھا کر اور کچھ ہیر ڈریسر کا کام کر کے بھی پی۔ ایف کے لئے جمع کی جائے۔ اپنی سیاسی وابستگی کو ظاہر کئے بنا کمائی جائے۔ میں نے لبنان میں ہیر ڈریسنگ کا کورس بھی کیا تھا۔ میں نے ایک بیوٹی سیلون میں دو ہفتے کے لئے نوکری کی درخواست دی (یعنی ایسٹر کی چھٹیوں کا استعمال) کام کرنے کے بعد میں پی۔ایف کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم پر چلی جاتی، کہ میں پراپگینڈے یا پیسے جمع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ

جانے دیتی۔ ایک دن ایک رئیس خاتون بال بنوانے کے بعد اپنے ہیئر سٹائل اور میرے کام سے اس قدر خوش ہوئی کہ اس نے مجھے ۲۵ فلز کا ٹپ دیا۔ پہلے تو میں چونکی اور جھجکی بھی، مگر دوسرے ہی لمحے پی۔ ایف میرے دماغ میں تھا اور میں نے فوراً رسید کاٹ کر دے دی۔ خاتون نے رسید پہ جب پی۔ایف کی مہر دیکھی تو پہلے حیران ہوئی اور پھر خوش ہو کر پی۔ایف کے لئے ایک دینار اور دیکر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ میری مینجر نے یہ دیکھا اور وہ بھی بالکل ناراض نہ ہوئی۔ البتہ اس نے یہ کہا کہ میں اپنی سیاست اپنے آپ تک ہی محدود رکھوں تو مناسب ہو۔ ویسے اس نے یہ بھی کہا کہ ایسی انقلابی روح تمام عرب خواتین میں بیدار ہونی چاہیئے۔ جب میں نے نوکری چھوڑی تو خاتون مینجر نے مجھے تنخواہ کے علاوہ پی ایف فنڈمیں پانچ دینار بھی دیئے۔

میں سب سے خوش عورت نہیں تھی۔ پارٹی مجھ سے ایسے کام کروا رہی تھی جن کو کرکے میں خوش بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسی سال موسم بہار میں، میں پڑھانا اور اپنے کویتی دوست چھوڑ عمان چلی گئی۔ روسی ساخت کی بندوق 'سیمینوف' میری ساتھی بن گئی۔

---

(۴)

عمان شہر گوریلوں سے بھرا پڑا تھا۔ اپنے ہی گھر میں فلسطینی ہونا اور بھی اچھا لگتا ہے۔ چند ہی دنوں میں مجھے بیس دیگر عورتوں کے ساتھ شمالی عمان کے ملٹری کیمپ میں اور بھی سخت تربیت کے لئے لے جایا گیا۔ یہاں میری خوش قسمتی کہ مقبوضہ علاقے کی بے مثل شخصیت اور ہم سب کی ہیروئن رشیدہ عبیدہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ مزاج اور شکل دونوں لحاظ سے خوبصورت عورت تھی۔ اسے بندوق استعمال کرنا اور حق کی خاطر اٹھانا بھی آتا تھا۔ میری دو دوست فوراً بن گئیں۔ ایک تو رشیدہ عبیدہ اور دوسری فیہا عبدالہادی۔

اس سے پہلے کہ ہمارے حوصلے اور ہمت کا امتحان لینے ، ہمیں مشن پہ روانہ کیا جاتا۔ ملٹری سکول کے پرنسپل کامریڈ حسن نے ہمیں آخری ہدایات دیں۔ جس میں خصوصیت سے ابتدائی سیاسی فائدے

اور چندہ جمع کرنے کے طریق کار اور سیاسی فوجی نوعیت کے کام کا بنیادی فرق بتایا۔ اس نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا۔" ہمارے کام کی یہ شق دقت طلب اور شدید ہے۔ جب یہ شروع کر دو گی تو پھر عمل کئے بغیر واپسی ناممکن ہے۔ اس لئے آپ کے شعور کے امتحانات کے لئے یہ مرحلہ ہے۔ اگر آپ کو اب بھی خود پہ اعتبار نہیں تو لوٹ جائیے اور کچھ اور کیجئے۔"

یہ سن کر ہم سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک خوف کی لہر سارے بدن میں دوڑ گئی۔ تین گھنٹے تک یہ اعصاب شکن جنگ جاری رہی۔ پھر ذہن میں سوال اٹھا کہ ہماری تربیت کا مطلب آپریشن تھا کہ متفرق وقت کے لئے استعمال ہونے والی شخصیت بنا پھر موومنٹ میں عورتوں کی حیثیت اور کردار کا ہم لوگوں نے تجزیہ کیا۔ اسی طرح والدین، دوستوں اور شوہروں کے ساتھ روابط کا سوال بھی سامنے آیا اور آخری جواب یہ آیا کہ اگر عورت خود کو انقلاب سے حتمی طور پر منسلک سمجھتی ہے تو پھر ماضی اور مستقبل کا ہر رشتہ اور ہر خواہش زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل کرے گی۔ ہم میں سے اگر کوئی عورت ایسا عہد نہیں کر سکتی۔ تو پھر وہ محض حمایتی یا چندہ جمع کرنے والی گڑیا بن کر موومنٹ سے منسلک رہ سکتی ہے۔ مگر جنہوں نے ملٹری آپریشن کی تربیت لی ہے اور جو انقلاب کے فلسفے کو یقین اور ایمان کی حد تک استوار سمجھتی ہیں۔ ان کو آگے جانے کا کام کرنا ہوگا۔

ہُوا یہ کہ وہ تمام لڑکیاں جو تربیت کو لطف کے لئے حاصل کر رہی تھیں وہ تو چھوڑ گئیں۔ میں اور رشیدہ نے رضامندی کا اظہار

کیا تو کامریڈ نے رشیدہ سے کہا کہ اس کے والدین کا باقاعدہ اجازت نامہ فائل میں موجود نہیں ہے۔ رشیدہ نے اس پر بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ اگر ۲۵ سال کی عمر کا ہو کے بھی والدین کی رضامندی کی ضرورت ہے تو پھر پی۔ ایف میں شمولیت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ گھر جا کر والدین کو کہیں جہیز بنائیں۔ آپ کے لئے دولہا ڈھونڈیں اور گھر بسائیں۔

میں نے رشیدہ کی طرح کھری باتیں تو نہ سہیں، پر کہا۔ میڈم! فلسطین نے ہمیں جوان کیا ہے کہ ہم اپنی سرزمین کا قرض اتار سکیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نابالغوں کے سے کام چھوڑ کر جرأت مندانہ اقدامات کی جانب توجہ کرنی چاہیئے۔

اب تین زیرِ تربیت خواتین نے آگے جانے سے معذرت کی اور باقی خواتین کے لئے تربیت کی اگلی منزل سامنے تھی۔

کامریڈ حسن ہمارے ٹینٹ میں پھر آئے۔ اس وقت رات ہو رہی تھی۔ ہم اردن کے چٹیل پہاڑوں میں پناہ لینے کے وقت کے منصوبے بناتے رہے۔ میں بہت اعصابی کھنچاؤ محسوس کر رہی تھی۔ کچھ کو نامعلوم کی جھجک تھی اور کچھ کو خوف۔ میں نے جب یہ سوچا کہ آخر کو میرا خواب حقیقت میں بدل رہا ہے۔ میری اعصابی تھکن دُور ہو گئی اور میں آنے والے وقت کے لئے تیار ہو گئی۔

کام کا وقت قریب آ رہا تھا مگر کام کی نوعیت واضح نہیں تھی پہاڑوں میں رہتے ہوئے یہ تیسری رات تھی۔ ایک کامریڈ گارڈ بڑی اضطراری کیفیت میں صیہونی چھاپہ ماروں کی نگرانی کر رہی تھی اور آواز

پر تڑپ کر پلٹتی تھی۔ اس نے چھاپہ مار کو رُکنے اور اپنی شناخت کروانے کو کہا۔ وہ نہیں رکا۔ کامریڈ نے اندھیرے ہی میں فائر کیا۔ دوسرے ہی لمحے کیمپ میں موجود ہر کمانڈو پیٹ کے بل آگے سرک رہا تھا کہ دشمن کو پکڑ سکے۔ صورتِ حال نارمل کر رہی تھی کہ اگر ایک چھاپہ مار سامنے آیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دو تین اس کے قریب ہی اور موجود ہونگے ہمیں جلدی علم ہو گیا کہ اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ البتہ کامریڈ گارڈ نے ایک مار گرایا تھا۔ یہ ایک گدھا تھا جو دشمن کی سرحد کی جانب سے اِدھر آیا تھا۔ ہم نے ایک مختصر اجلاس کر کے گدھے کے مالک کو ہرجانہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سرحد پار یا اِدھر ہی سے کوئی بھی اس کا ہرجانہ وصول کرنے نہیں آیا۔ پر یہ مذاق کی بات تھی اور کیمپ میں پھر کوئی ایسی مذاق کی بات نہیں ہوئی۔

ہمیں اطلاع ملی کہ اسرائیلی ۵ جون کو جنگِ جون کی یاد منانے کے لئے ۵ بجے صبح ہمارے کیمپ پہ بمباری کرنے والے ہیں۔ صبح تین بجے میں بات چیت سے لوٹی تھی اور چاہتی تھی کہ دو ایک گھنٹے سو لوں۔ مگر کامریڈ بسم نے فوراً روانہ ہونے اور بھاری اسلحہ نکالنے کا حکم بھی دیا۔ اسی شام ہمارے پاس عراق کے فن کار آئے تھے کہ انقلابیوں اور انقلاب کے منصوبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں آرٹسٹ مہمانوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے۔ وقتِ مقررہ پہ اسرائیلی جہاز آئے۔ بم برسائے۔ ان کو کسی نے نہ ٹوکا، نہ روکا، نہ للکارا کہ حسین کی فوج اسرائیلیوں کے نہیں بلکہ فلسطینیوں کے خلاف استعمال ہوتی تھی۔

بے چارے فلسطینی کہ جن کے پاس ایک بھی جہاز نہیں تھا، عالمی پریس نے اس واقعہ کو صرف ایک حادثے کی حیثیت سے رپورٹ کیا اور جون چار سالگرہ کو پُرامن دن قرار دیا۔ ہم واپس اپنے کیمپ آ گئے۔ اور صیہونی دشمن سے لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

کیمپ میں، میں نے اپنی تیاریوں سے ثابت کر دکھایا کہ میں بہت اچھی گوریلا لڑاکا تھی۔ میں تمام احکامات کو شعوری طور پر پورا کرتی۔ میرے انسٹرکٹر میری کارکردگی پر نکتہ چینی کرتے، نہ تعریف اور نہ مجھے کسی خاص منصوبے کو پورا کرنے دیتے۔ مجھے معلوم تھا کہ پی ایف رہنما میری خواہش کو ملحوظ تو رکھیں گے۔ مگر میری کارکردگی شاید معیاری نہ تھی۔

تربیت کا پروگرام اتنا وسیع تھا کہ ہمارے پاس کسی قسم کے ہلکے پھلکے پروگرام کے لئے وقت ہی نہیں نکلتا تھا۔ ایک دفعہ غیر ملکی طلبہ کا گروپ آیا۔ ہم اس کے لئے ورائٹی پروگرام کر رہے تھے۔ اس پروگرام میں ہم بودوان علاقے کے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے بودوان زندگی کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ یہ غیر ملکی طلبہ عمان میں فلسطینی طلباء کی تنظیم کی جانب سے بین الاقوامی سلامتی اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ بہت سے مغربی یونیورسٹیوں سے ۱۹۶۸ کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اگر سڑک پر ننگے ہو جائیں، یونیورسٹی پر قبضہ کریں، کسی افسر پر تھوک آئیں یا اس کی بے عزتی کردیں، تو یہ سب انقلابی سرگرمی قرار دی جاتی ہے۔ میں تو ان سے بات ہی کرنے کے خلاف تھی۔ ہر چند اِن میں سے کچھ خود کو انتہا پسند

انقلابی کہتے تھے۔ مگر میں مغربی درندوں کا یوں نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور اب میں خوش ہوں کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان کے انتہا پسند انقلابی بھی مارکسسٹ لیننسٹ لیڈروں کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کچھ امریکی تھے جو خود کو مزدور طبقے سے متعلق کر کے عوامی رابطے پر اعتماد کرتے تھے۔ اس گروپ کے تمام افراد قومیت کو کولونیلزم کی ایک شکل سمجھتے تھے۔ بلیشتر طلباء گوریلا تھیٹر کو محبوب مشغلہ مانتے تھے، کہ وہ "انقلاب بنانے" کا کامیاب نسخہ تھا۔ انہوں نے تھوڑا سا تھیٹر کر کے ہمیں بھی دکھایا۔

جب وہ رخصت ہو رہے تھے۔ ایک جرمن اور ایک فرانسیسی طالب علم نے جو کہ دونوں انارکسسٹ تھے، نعرہ لگایا "بحران زندہ باد۔" میں نے جواباً کہا کہ فلسطینی لوگ تو بحران زدہ زمانے میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بحران زدہ معاشرہ کہ جس میں نہ قیادت ہے نہ اختیار وہ تو صیہونیوں کے قبضے میں ہمیں چھوڑ کر خوش تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بڑی ہوئی داڑھیوں اور بالوں یا اَیرگن۔ ان میں سے کونسا نسخہ ہماری جلاوطنی کو ختم کرنے کے لئے وہ تجویز کرتے ہیں۔ وہ لاجواب ہو کر مسکرائے اور رخصت ہو گئے۔

ہماری مزاحمتی تحریک کو بنیادی نقصان اردنی اور فلسطینی عوام کا ایک نہ ہونے کے عمل سے پہنچا ہے۔ "فتح" نے بھی اردنی عوام تک پہنچنے کا کوئی کامیاب منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ ہم فرنٹ کے ممبران بھی عرب اتحاد میں عومی اور اردنی اور فلسطینی عوام میں خصوصی اتحاد کے لئے

کوشاں تھے۔ ہم نے اپنے کیمپ کے نزدیک بوڈدان کے لوگوں سے
ملنا جلنا اور ان کے مسائل حل کرنے شروع کیا۔ آخر کو ہم ان کو ہم خیال
بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے ان کو ملٹری تربیت بھی دی۔ اور
بعد میں تو یہ حال تھا کہ وہ بلا جھجک ہمارے خیموں میں آجاتے اور
ہم ان کے خیموں میں جاکر باہمی مسائل پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔

مجھے اور کمانڈر بسم کو علاقے کے لوگ اپنے بڑے کھانوں اور
تہواروں پہ مہمانِ خاص کی حیثیت سے بلاتے۔ ایک دن ہم نے اُن کے
علاقے کی شادی میں شرکت کی۔ رات کا کھانا تھا کہ جس کے بعد
دلہن کو دولہا کے خیمے میں لے جایا جانا تھا۔ چاند پوری آب و تاب سے
چمک رہا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں والہانہ سرشاری میں رقص کر رہے
تھے۔ میں اور بسم بھی یہ ماحول دیکھ کر مدہوش ہوتے جا رہے
تھے۔ ابھی ہم سرشاری کے عروج پر تھے کہ ایک شخص آیا۔ میرے
ہاتھ میں ایک چٹ پکڑائی۔ لکھا تھا "فوراً آجاؤ"۔ میں نے پلٹ کر
دلہن کو پیار کیا اور واپس آگئی

کمانڈر نے روکھے انداز میں کہا: "ہمیں حکم ملا ہے کہ تم صبح ۱۰
بجے تک بیروت پہنچ جاؤ۔ اس وقت رات کے نو بجے ہیں"۔ میں
نے فوراً اپنا سامان باندھا اور بیروت کے لئے چل پڑی۔ نہیں جانتی
تھی کہ راستے میں کیا کیا مشکلات آئیں گی۔ شام کی سرحد پر مشکل
آئی بھی مگر جلدی حل ہو گئی۔ اور میں عین وقت پر بیروت
پہنچ گئی۔

کمانڈر میرے انتظار میں تھا۔ میں نے جاتے ہی شور مچانا شروع

کر دیا۔ "یہ کیا طریقہ ہے بلانے کا۔ میں نے اتنی محنت سے لوگوں
کو منظم کیا اور ابھی ان کی تربیت کے کچھ دن باقی تھے"۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم انہیں منظم کر لوگی۔ اس لئے تو تمہیں بھیجا
تھا۔ مگر تم چیخ کیوں رہی ہو؟ کمانڈر نے ملائمت سے کہا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ میں نے سمجھا کہ آپ نے میرے خاندان
کے دباؤ میں آکر مجھے واپس بلا لیا ہے"۔

کمانڈر مجھے یقین دہانی کرانے کے انداز میں مسکرایا اور بولا:
کامریڈ خالد! تم جیل جانے کو تیار ہو۔

"بالکل جناب"۔ میں نے تڑاخ سے جواب دیا۔

"کیا اذیت سہہ سکوگی؟"

"جناب"

"کیا تم مرنے کو تیار ہو؟"

"جناب۔ مگر آپ ایسے سوال کیوں کرتے ہیں؟ یہ باتیں تو ہم نے
عہد کی ہوتی ہیں"۔

"ٹھیک ہے" کمانڈر نے مزید ملائمت سے کہا۔ "آؤ اب ہم دوسرے
نکتے پر بات کریں"۔ میں بیتاب تھی اور کمانڈر بے پناہ سنجیدہ۔ وہ
آگے بولا۔ "لیلیٰ! تمہارے سپرد ایک اہم مشن ہے۔ جاؤ گھر جاؤ
اور سب کو خدا حافظ کہہ آؤ۔ کل صبح ۱۰ بجے واپس آجانا"۔

میں یہ خبر سن کر بے پناہ خوش ہوئی اور مشن کی تفصیلات پوچھنے
کا بھی حوصلہ نہ ہوا۔

گھر گئی تو اماں یہ سن کر شک میں پڑ گئی کہ میں پھر کویت

جا رہی ہوں۔ انہوں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ میں نے نہ نئے کپڑے بنائے تھے۔ اور نہ کسی سے زیادہ بات ہی کر رہی تھیں۔

"لیلیٰ! میں تمہارے لئے خالص فلسطینی ڈش بنانے والی ہوں۔ مقلوبہ بنا رہی ہوں اور یہ لبنانی قیمے کے ساتھ بنتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں تم سے کچھ دن نہ مل سکوں گی۔ اس دفعہ تم گرمیوں میں بہت جلد کویت جا رہی ہو۔"

میں نے ماں سے کہا۔"اماں! میرے لئے ضرور خاص ڈش بناؤ۔ میں نے بہت دن سے تمہارے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ ہم سب بہت دن بعد مل کر کھانا کھائیں گے۔" میں یہ کہہ تو رہی تھی۔ مگر میرا دماغ کہیں اور مصروف تھا۔

صبح صبح میں بیروت چلی گئی۔ ابو زید۔ میرے انتظار میں تھا۔ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سنجیدگی لئے اس نے کہا:"لیلیٰ! تم کو ٹی۔ ڈبلیو۔ اے۔ جہاز اغوا کرنا ہے۔"

میں یہ سن کر ہنس پڑی۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

کمانڈر ابو زید نے پوچھا۔

"جب آپ نے یہ فقرہ کہا تو مجھے لگا کہ جیسے مجھے جہاز کندھوں پر رکھ کر بھاگنا پڑے گا۔ تمام محافظوں، چوکیداروں اور جہاز کو بچانے والوں کو دھوکا دیتے ہوئے۔"

کمانڈر نے میرا جواب نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔"جاؤ۔ جہاز اغوا کرو اور کسی کو اپنا منصوبہ خراب نہ کرنے دو۔"

میں نے پورے منصوبے کی ریہرسل کی اور ہر تفصیل کو ذہن نشین کر لیا۔ میں روم جانے والے جہاز میں تھی کسی عشق کے چکر میں نہیں، بلکہ امریکی سامراج کے خلاف ایک اہم مشن پر۔

امریکہ میں فلسطین

"ہمیں سخت ہونا چاہیئے مگر اپنے اندر کی ملائمت کو ضائع کیے بغیر"

چے گویرا ۱۹۶۷ء

(۱)

عربوں کو ان کے دشمن اور دوست ، جذباتی لوگ کہتے ہیں.
میں فلسطینی عرب ہونے کے ناطے جذباتی ہونے کو منطق سمجھتی ہوں
کہ مجھ سے میری سرزمین چھین لی گئی۔ اور مجھ سے میرے حال اور
مستقبل دونوں کا وجود نفی کر دیا گیا۔ مگر میں جذباتیت کے ہاتھوں
زندہ درگور ہونے کو تیار نہیں۔ کہ میرے اندر کا اعتماد مجھے اپنی
سرزمین کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کی جانب لئے چلتا ہے۔
دشمن کی بے پناہ قوت کے باوجود میں نظریاتی اور حربی قوتوں پہ
یقین رکھتے ہوئے عوام میں تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگی.
میں نے اپنے کام پہ منطق کی سربرآری قبول کی ہے نہ کہ جذبے کی۔
اور میری پارٹی پاپولر فرنٹ بھی کام سے پہلے اس کے جواز پہ غور کرتی ہے۔

کام کرنے کو نصب العین بنائے ہوئے ہیں کہ ہمارے عمل کا مقصود
دشمن کو بے نقاب کرنا اور موجود حقیقتوں کی ہیئت تبدیل کرنا ہے.
کہ جنہیں موشے دایان اٹل سمجھتا ہے۔ ہم دشمن کو اپاہج کرنے
کرنے کے لئے قوتیں مجتمع نہیں کرتے کہ ہمارے پاس اتنی قوت
اور بھاری اسلحہ نہیں ہے۔ ہم تو دشمن کے دل میں خوف اور
عوام کے دلوں میں انقلاب کے لئے احساسات کو فزوں کرتے
ہیں۔ صیہونیوں نے صیہونیت زدہ مغربی رائے عامہ کو متاثر کیا ہے
کہ وہ بزدل لوگوں میں اپنی بہادری کے گن گاتے ہیں۔ جبکہ ہم
لوگ مغرب کے بہرے کانوں میں چیخ چیخ کر اپنے عوام کے لئے
انقلاب اور فلسطین کے قیام کی ضرورت کے الفاظ داخل کرتے
ہیں۔ ڈاکٹر جارج حبش سیکرٹری جنرل پی ایف ایل پی نے ایک
دفعہ کہا تھا :

”۲۲ سال تک کیمپوں میں رہ کر اور کسی کو اپنا نگہدار یا ہمنوانہ
پاکر، ہم نے اپنے انقلاب کو محفوظ کرنے کا خود ہی ارادہ کیا ہے.
کون سی چیز ہمارے انقلاب کو آگے بڑھاتی ہے ، کون سی تحفظ
دیتی ہے ، کون سی اضافہ کرتی ہے۔ یہ ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ ہمارے
انقلاب کا مطلب ہے انصاف۔ ہمارے گھروں کی واپسی ، ہمارے
ملک کی واپسی اور ہمارے بچوں کے لئے پناہ گاہ کا احساس۔“

(۱۲ جون ۱۹۷۰ء)

مجھے نہیں معلوم کہ میری زمین پہ قابض اور جارح ، مجھ پر
جارحیت کا مقدمہ چلا سکیں گے۔ اگر وہ اخلاقیات کی توقع کرتے

ہیں تو اخلاقیات کا یہی تقاضا ہے کہ نہتے لوگوں پر جب جی چاہا، بمباری کر دی جائے۔ ۲۹ اگست ۶۹ء کو میرا انقلابی اقدام فلسطینیوں کی انسانیت کا اعلامیہ تھا۔ مغرب کی صیہونیت پرست پالیسیوں کے خلاف احتجاج نامہ تھا۔

جرمن نے صیہونیوں کے الفاظ میں ۹ بلین مارک دے کر ۶ ملین یہودیوں کو جلاکر راکھ کر دیا ہے کہ یہ اسرائیل کے قیام کا تاوان ہے۔ اسرائیل کہ جو متحدہ صیہونی جیوری کے لئے محفوظ مقام ہے۔ ۱۹۶۵ء سے تو اسے مکمل طور پر اسرائیل کا نام دیا جا رہا ہے۔ جرمن دارمیں نازی چانسلر نے اسرائیلیوں کو گیس ماسک دیے تھے کہ وہ خود کو عربوں کی جرثومیات کی جنگ سے محفوظ کر سکیں۔

فرانس نے بھی اسرائیل کو مسٹریز، سپر مسٹریز اور میراج طیارے دینے کے علاوہ ڈیگال نے اپنی مرضی کے خلاف اسرائیلیوں کو فرنچ گن بوٹس چراکر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مزید برآں گائے موٹے، فرانس کے سوشلسٹ پرائم منسٹر نے بن گوریون اور انتھون ایڈن سے سازش کر کے ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ کروایا تھا۔ فرانس نے اسرائیل کو سائنسی ماہرین اور اشیاء فراہم کیں کہ وہ دمیوا پہ ایٹم بم بنانے کا کارخانہ لگا سکیں اور اس کا نام ظاہری طور پر ٹیکسٹائل فیکٹری رکھا گیا۔

سوئٹزرلینڈ جو خود کو غیر جانبدار ملک کہتا ہے۔ اس نے نہ صرف عرب انقلابیوں کو قید کیا بلکہ فلسطینیوں کے قاتلوں کو رہا کیا۔ مزید برآں صیہونی اغوا کنندوں کی حرکتوں سے چشم پوشی کی کہ ان

نابکاروں نے میرے عوام کے لئے سائنسی کام کرنے والے ماہرین کو مار ڈالا تھا۔ سوئٹزرلینڈ نے تو ان صیہونیوں کو بھی سزا نہیں دی تھی جو اس کے ملک کے راز چرا کر لے گئے تھے اور مسٹری کے بلیو پرنٹس بھی دوسروں کو دے دیئے تھے۔

برطانیہ، میرے ملک کے لوگوں سے متعلق ہر جرم کا ذمہ دار اور قصوروار تھا۔ اس کا تاریخی جرم تو میری شخصیت کا قتل، میری سرزمین کی بے حرمتی اور میری تاریخ کا نام و نشان مٹانا ہے۔

امریکہ نے برطانیہ کے جرم کو تواتر دیا ہے۔ اس نے اسرائیل کو ہاک میزائل، سکائی ہاک اور فینٹم فائٹرز دیئے ہیں۔ امریکہ، اسرائیل کا دفاع کرنے اور مالی استحکام بخشنے والا ملک ہے۔ دوسرے لفظوں میں امریکہ اسرائیل اور اسرائیل امریکہ ہے۔ اور فلسطین کا مسئلہ ہو تو یورپ بھی امریکہ کے ساتھ ہے۔

اب میں اپنے قارئین کو مغرب کی مزید ژولیدہ کاریوں سے آگاہ کرنا نہیں چاہتی ہوں کہ ان کی وضاحت، انقلاب کے مراحل کے ساتھ ساتھ ہوتی جائے گی۔

۲۹ نومبر ۶۹ء کو نکسن نے امریکہ کی صیہونی تنظیم کے اجلاس میں صدارتی خطبہ دینا تھا۔ پی۔ایف کو معلوم تھا کہ نکسن کو کیا کہنا ہے۔ کہ وہ پہلے بھی جون وار کے موقع پر جب اگست ۶۷ء میں فاتح اسرائیل کو جتا آیا تھا کہ مقبوضہ علاقے میں سے کچھ واپس کرنا، بغیر امن کی یقین دہانی کرائے، سخت غلطی ہوگی۔ علاوہ ازیں نکسن اور ہمفرے نے اپنی انتخابی مہم اکٹھی شروع کی تو نکسن نے صیہونیوں کو خصوصی

مخاطب کیا تھا۔

۲۹ نومبر ۶۹ء کو ہم توقع کر رہے تھے کہ مسٹر نکسن لوس اینجلز خود آکر صیہونی کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ ٹی ڈبلیو اے فلائٹ ۸۴۰ روم سے روانہ ہوئی۔ مگر مسٹر نکسن نہیں آئے۔ انہوں نے اپنی جگہ ایک پیغام بھیج دیا۔ جو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ پیغام میں کہا گیا کہ امریکہ اسرائیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا پابند ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ اسرائیل سے سماجی اور معاشی کے علاوہ تہذیبی بنیادوں پر بھی ہم آہنگی اور اتفاق چاہتا ہے۔

صیہونی، لوس اینجلز میں جمع ہو رہے تھے۔ کیلی فورنیا کے گورنر رونالڈ ریگن اور گولڈ امیٹر کے گرد صیہونیوں کا مجمع تھا۔ میں روم جانے والی فلائٹ کو دمشق کی جانب موڑنے کے منصوبے کو دھیان میں رکھے بے تکلفی سے سنگر سوئنگ مشین کمپنی کے مڈل ایسٹ سے متعلق ایجنٹ سے بات چیت کر رہی تھی۔

میں نے ہنگامی حالت میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کی تربیت لی تھی۔ البتہ انسانی بدلتی ہوئی صورتِ حال سے نمٹنے کی تربیت مجھے نہیں تھی کہ بیکار بولتے رہنے والوں سے کیسے نمٹا جائے۔ ان سے گستاخی سے نہ بولا جائے، نہ ان میں کسی قسم کے شک کا شائبہ جگایا جائے۔ وہ بولتا جا رہا تھا، میں اپنی سیٹ پر بہت بے چین ہو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے جہاز پہ موجود ہر سواری کو میرے مشن کا علم ہے۔

بیروت سے روم جانے والی اسی فلائٹ میں میرے ساتھ کی

سیٹ پر ایک اچھا نیک اور بااخلاق امریکی بیٹھا تھا۔ کہ جو نیویارک جانے کے لئے اس فلائٹ پر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ امریکی، دوسرے سیاحوں کی طرح زمین پر ہر چیز کے بارے میں مزے سے بات کرنی چاہتے ہیں۔ پر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر ذاتی سوال بھی پے بہ پے کئے جاتے ہیں۔ مسٹر ہولڈن بہت بور ہوئے ہوں گے کہ وہ تو بات کرنی چاہتے تھے۔ ان کا پہلا سوال تھا "آپ کہاں جا رہی ہیں۔" "میں روم جا رہی ہوں"۔ میں نے متانت سے کہا۔ اگلا سوال تھا: "روم کیوں جا رہی ہیں"۔ میں ایک لمحے کو جواب گھڑنے کو رکی اور پھر بولی "میں اپنے منگیتر سے ملنے جا رہی ہوں۔ جو مجھ سے ملنے کے لئے لندن سے آرہا ہے۔" مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے کچھ غلط بیانی کی ہے کہ اگر وہ یہ کہہ دے کہ روم میں مجھے ملو اور ہو سکے تو میرے ساتھ کھانا بھی کھاؤ تو میں کیا کہوں گی۔ میں نے فوراً اس کا جواب بھی گھڑ لیا۔ اور اس کے بغیر پوچھے اونچی آواز میں بولی: "یہ بھی ممکن ہے وہ ایرپورٹ آجائے اور مجھ سے پہلے پہنچ کر مجھے حیران کر دے۔" پھر میں نے ان سے پوچھا:۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"نیویارک۔" مسٹر ہولڈن نے اطمینان سے کہا۔ مگر ابھی وہ بات منقطع کرنے کے موڈ میں نہیں تھے، بولے۔ "ایک عرب لڑکی اکیلی اپنے منگیتر سے ملنے روم جائے اور اس سے شادی کرے' یہ عجیب سی بات لگتی ہے"۔ میں نے اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا: "ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ہماری منگنی ہوئے بھی کئی سال ہو

گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم ماڈرن عرب ہیں دقیانوسی نہیں۔ اب وہ مطمئن ہوکر اپنا قصہ سنانے لگا کہ کس طرح اسے اور اس کی بیوی کو بھاگنا پڑا کہ اس کی بیوی کے والدین نے ہولڈن کو ناپسند کیا تھا۔ میں نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ میں اپنے منگیتر کے ساتھ بھاگ نہیں رہی تھی۔ اتنے میں ائر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ جہاز میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔ جن کے پاس ایک بہت بڑا کیک ہے اور وہ ہم سب کے ساتھ مل کر کیک کھانا چاہتے ہیں۔ "کیا آپ لوگ کیک کھائیں گے۔" میں نے مسٹر ہولڈن اور دوسرے مسافروں کے ساتھ مل کر کہا۔ "ہم ضرور کھائیں گے۔" اس خوشی کے عالم میں مسٹر ہولڈن ایک دفعہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "یہ تم دونوں کی شادی کس طرح ممکن ہے کہ ابھی تمہارا منگیتر تو طالب علم ہے۔ ابھی تو اس کی نوکری بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "ہم تو دولتے نہیں۔ ہمارا خاندان جدی پشتی رئیس ہے۔ روزگار ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" "پھر تم یہ کرنا کہ ہنی مون بجر روم میں میرے بجرے میں ہی کرنا۔" میں نے بات کاٹ کر کہا: "نہیں میں تو لوگوں کے درمیان کروں گی۔ اس نے پھر پوچھا: "کیا تم لوگوں کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو۔" "نہیں"۔ مگر میں تو لوگوں کے ساتھ رہنے کو اچھا سمجھتی ہوں۔"

ائرپورٹ اتر کر کسٹم وغیرہ سے نمٹ کر مجھے ایک پورٹر سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ آخر وہ سیدھا سوال کر بیٹھا۔ "آج رات آپ سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟" میں نے آخر سختی سے کہا "معذرت

چاہتی ہوں۔ میں مصروف ہوں۔" مگر پھر روم میں بس میں سفر کرتے ہوئے پھر وہی سوال۔ پھر ایک اور ریشہ خطمی انسان، حتیٰ کہ ایک صاحب تو میرے قریب آکر بغیر کچھ کہے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لینا چاہتے تھے کہ میں چیخی۔ "اپنے ہاتھ پرے کرو، ورنہ میں تمہیں بس میں سے دھکا دے دوں گی۔" میری آواز اور غصہ دیکھ کر وہ سہم گیا اور راستے بھر میرے ساتھ کوئی اور حرکت نہیں کی۔

میں دو دن روم رہی۔ اسی عرصے میں گاہے بگاہے روم کی سیر کرانے کے دعوت نامے بڑی شد و مد کے ساتھ ملتے رہے۔ میں ملائمت سے انکار کرتی رہی۔ میں اکیلی روم کی گلیوں میں گھومتی پھری۔ مجھے کوئی چیز خریدنے کا شوق نہ تھا۔ میں روم کے قدیم تہذیبی کھنڈرات دیکھنا یا فلم پر جانا پسند کر رہی تھی کہ میں چلتے چلتے صرف اور صرف اپنے مشن کی تفاصیل اور باریکیاں اپنے ذہن میں دہرا رہی تھی۔

۲۹ اگست کی صبح میں ہوٹل سے حساب صاف کر کے نکلی اور فومیکیفو ائیرپورٹ کے لیے بس پکڑی۔ یہ ائیرپورٹ روم کے نواح میں تھا۔ جہاز آدھا گھنٹہ لیٹ تھا۔ میرا ساتھی کہ جسے میں نے تصویر سے پہچانا تھا۔ پروگرام کے مطابق آگیا اور ہم نے اپنے مخصوص اشارات کا تبادلہ کیا۔ اس کا نام سلیم عیسادی تھا۔ وہ حیفا کا رہنے والا فلسطینی کہ جس کی پرورش شام میں ہوئی تھی۔ سلیم خاموشی سے میرے پاس بیٹھا رہا اور ہم جان بوجھ کر ایک دوسرے کو نہ پہچاننے اور ناواقف ہونے کی علامات ظاہر کرتے رہے۔

سب کچھ بالکل مناسب اور شیڈول کے مطابق ہو رہا تھا کہ ہماری محتاط منصوبہ بندی کو دھچکا لگا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک بچی بیٹھی تھی۔ کھلتے ہوئے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے پر کڑھا ہوا تھا "دوست بناؤ"۔ اس بچی کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ اس بچی نے تو میرا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ میری قوم کو کوئی

نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اس پر ظلم کس لیے؟ کہ جہاز اغوا ہونے کے بعد ممکن ہے اسرائیلی انٹی کرافٹ توپوں کے ذریعے اسرائیلی فضائیہ جہاز اڑانے کی کوشش بھی کرے۔

اب میرے سامنے فلسطین کی ساری جدوجہد اور اس کے بچوں کی مجبوریاں پرت در پرت کھلتی چلی گئی۔ میں نے اپنی جلاوطنی کے اوّلیں دن سے لے کر آج تک بے خانماں، بھوکے اور ننگے پیر انسانوں کے قافلے، اپنے تصور میں چلتے ہوئے محسوس کئے۔ بقین کیمپ کے دو بار مہاجر ہوئے بچے، عمان کے قریب عجیب بے چارگی کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "ہم بچے بھی تو آخر نسل انسانی کا حصہ ہیں"۔

اس منظر سے مجھے اور بھی تقویت ملی اور میں نے اپنے آپ سے کہا "میں نے اور میرے لوگوں نے کیا جرم کیا تھا کہ ہماری تقدیر میں یہ آلام لکھے گئے"۔ جواب تھا کوئی جرم نہیں کیا۔" پھر آگے بڑھو۔ پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے بچوں نے میرے اندر کہا۔

۷۰۷ بوئنگ کی جانب جلتے ہوئے ایک اور مسئلہ اچانک سامنے آگیا۔ کوئی تیس برس کا بھلا سا نوجوان میرے پاس آیا اور بڑی خوش دلی سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "ہیلو۔ ہیلو" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے افسردہ انداز میں جواباً کہا میں اس وقت رکارڈو ردجو کی کتاب "میرا دوست چے" پڑھ رہی تھی اور وہ شخص مجھ سے بات کرنی اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں۔ میں اب شادی والا سارا قصہ دہرا نہیں سکتی تھی۔ میں نے کہا "تم خود اندازہ لگاؤ"۔

اس نے سوچ کر کہا "یونانی ... ہسپانوی ... اطالوی"۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں کا ہے۔ اس نے کہا "میں تسکاگو کا رہنے والا ہوں" اور پھر اپنے سوالات شروع کر دیئے "تم جنوبی امریکہ کی رہنے والی نہیں ہو"۔ مجھے یہ جاننے کے بعد کہ وہ خود کہاں کا رہنے والا ہے، سوچ آئی کہ اگر میں خود کو جنوبی امریکہ کی رہنے والی کہہ

دوں تو حرج بھی کیا ہے — اور میں نے کہہ دیا۔

"برازیل" اس نے یہ کہا اور دو قدم اور میرے نزدیک آگیا۔ میں نے گھبرا کر کہا "تم میرے قریب کیوں آ رہے ہو"۔ "تم بولیویا سے ہو نا"۔ "ہاں" میں نے جواب دیا "مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا"۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کتاب نے بتایا"۔ اس نے اطمینان سے کہا۔

"تو کیا تمہیں بھی چے اچھا لگتا ہے"؟

"ہاں۔ اچھا آدمی تھا۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو"۔ میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ "میں اپنی والدہ سے ملنے ایتھنز جا رہا ہوں۔ میں انہیں گزشتہ پندرہ برس سے نہیں ملا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ایئرپورٹ پر پہلے ہی میرے لیے منتظر ہوں گی"۔

"تم بے وقوف — تم اس جہاز سے مت جاؤ۔ کیونکہ یہ جہاز ایتھنز نہیں جا رہا ہے"۔ میرے منہ سے یہ سب کچھ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ میں پھر "میرا دوست چے" پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس شخص کے خیالات نے مجھے پھر اپنی سرزمین کے کھو جانے کی اذیت سے دو چار کر دیا۔ اور اب یہ خیال بھی سامنے آیا کہ اس کی جلاوطنی رضاکارانہ تھی جبکہ میری جلاوطنی مجبوراً تھی۔ مگر اپنے ردِ عمل سے خود محفوظ رہنے کے لیے میرے ضمیر نے کہا کہ ان تمام کے باوجود کام پورا کرنا ہے، مشن جاری رکھنا ہے اور واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

جہاز کو اڑائے ابھی مشکل سے بیس منٹ ہوئے تھے کہ ایئر ہوسٹس نے فرسٹ کلاس کے پانچوں مسافروں کی خدمت اور مدارات شروع کر دی۔ نہ میں اور نہ سلیم کچھ کھانے کے لیے تیار تھے۔ ایئر ہوسٹس بڑی احساس کرنے والی تھی اس نے ڈرنکس اور مونگ پھلیاں پیش کیں۔ پھر کہا کہ جو کچھ بھی ہم پسند کریں طلب کریں۔

میں نے کافی کا آرڈر دے دیا اور سلیم نے بئیر کا، مگر انہوں نے ہمیں نروس کر دیا کہ ان کا بار بار ہم سے آکر پوچھنا، ہمیں پریشان کرنے کو کافی تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میرے پیٹ میں درد تھا اور میں نے کمبل مانگا۔ کمبل اپنی گود میں رکھ لیا۔ تاکہ میں اپنے پرس سے ہینڈ گرنیڈ نکال کر رکھ سکوں۔ پستول نکال کر میں نے اپنی پینٹ کے اُوپر کے حصے میں ایسا رکھا کہ دکھائی نہ دے۔ سلیم نے ایک اسپرین کی ٹکیہ کے لیے کہا۔ مجھے خوف ہوا کہ ائیر ہوسٹس فرسٹ کلاس کے دو مسافروں کے بیمار ہونے پر پریشان ہوگی۔ مجھے بھی ڈر لگا کہ کہیں واقعی سلیم کے سر میں درد تو نہیں ہو رہا۔ مگر جب سلیم نے گولی لے کر پینٹ کی جیب میں رکھ لی تو مجھے اطمینان ہوا۔ جیسے ہی فرسٹ کلاس کا ایک مسافر لاؤنج سے واپس آیا، میں نے سلیم کو اشارہ کیا کہ وہ کاک پٹ کی طرف جائے کہ اُسی لمحے ایک اور ائیر ہوسٹس جہاز کے ہوا بازوں کا لنچ لیے کاک پٹ کا دروازہ کھول رہی تھی۔ سلیم نے موقع بھانپ لیا اور اچھل کر اس سے آگے آ گیا۔ ائیر ہوسٹس چیخی "اوہ نہیں۔" اور ٹرے اچھل کر گری۔ بہت شور کی آواز آئی مگر کوئی زخمی نہیں ہوا۔ میں سلیم کے پیچھے پیچھے تھی۔ ائیر ہوسٹس کو متنبہ کیا کہ راستہ نہ روکے۔ اس نے لرزتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ سلیم اتنا چوڑا تھا کہ میں آگے دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ البتہ میں نے سلیم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جہاز کو چے گویرا کمانڈو یونٹ منسلکہ پی۔ ایف۔ ایل۔ پی نے اغوا کر لیا ہے اور اب جہاز کے نئے کپتان کا نام ہے شادیہ ابو غزالہ۔

اس کے اعلان کے دوران میری پستول سرک کر میری پینٹ کے درمیان تک پہنچ گئی۔ میں اُسے اٹھانے کو جھکی تو جہاز کے عملے کے خوف زدہ چہرے مجھے نظر آئے اور انہوں نے سر پر چیک کی چوڑی ہیٹ رکھی دیکھی۔ مجھے ایک لمحے کو یہ سب کچھ بڑا مضحکہ خیز لگا۔ میں اپنے اندر ہی اندر ہنسی۔ پستول سنبھال کر رکھی اور کاک پٹ میں ہینڈ گرنیڈ گھماتی ہوئی داخل ہو کر اعلان کیا کہ میں نئی کپتان ہوں۔ جہاز

کا عملہ مجھے دیکھ کر تو بالکل حیران رہ گیا۔ میں نے اپنی صلاحیت کے بھرپور مظاہرے کے لیے اپنے سے پہلے کپتان کارٹر کو ہینڈ گرنیڈ کا سیفٹی پن، اس واردات کے تحفے کے طور پر دیا۔ اس نے بڑے سلیقے اور عزت سے انکار کیا اور میں نے اس کے پیروں پر پن گراتے ہوئے تقریر کرتے ہوئے کہا "اگر تم میرا حکم مانو تو ٹھیک ہے ورنہ پھر تم جہاز اور مسافروں کی حفاظت کے ذمہ دار ہو گے۔"

"لیڈا چلو۔" میں نے ہدایت دی۔ "لاڈ" اس نے سوال کیا، اسرائیلی نام لیتے ہوئے میں نے غصے سے کہا "تم انگریزی سمجھتے ہو کہ نہیں۔ سنو! تم بس میری ہدایات پر عمل کرو ———— اور بے وقوفی کے سوالات نہ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔" ہرچند مجھے معلوم تھا کہ جہاز میں تین گھنٹے اور ۴۵ منٹ تک چلتے رہنے کا ایندھن موجود ہے۔ پھر بھی انجینئر پر رعب ڈالنے کو میں نے کہا "تمہارے پاس کتنے وقت کے لیے ایندھن ہے۔" "دو گھنٹے" انجینئر نے کہا۔

"جھوٹے، دغاباز۔ مجھے بھی بوئنگ کے بارے میں سب کچھ پتہ ہے۔ اب اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو تمہاری گردن ایک جھٹکے سے توڑ ڈالوں گی۔" پائلٹ نے میرا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں غصے کہاں تھی۔ میں تو بہت زیادہ خوش تھی۔ پائلٹ نے جہاز کے عملے کو نئے کپتان کے احکامات ماننے کی ہدایات دیں۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ کپتان تعاون کر رہا ہے۔ میں نے اسے ریڈیو روم ملانے کو کہا کہ میں اطالوی عوام کے سامنے وضاحت کر سکوں۔ کپتان نے کہا کہ ابھی ہم بہت دور ہیں۔ مگر میں نے کوشش کرنے کی ہدایت دی۔ مگر بے سود۔ میں نے ائیر ہوسٹس کو ہمارا دستی سامان آگے لانے کا حکم دیا اور کہا کہ تمام فرسٹ کلاس مسافروں کو ٹورسٹ کلاس میں بھیج دیا جائے۔ پھر میں نے انٹرکام نظام چالو کرنے کی ہدایات دے کر مسافروں کے سامنے یہ پیغام پڑھا۔

"خواتین و حضرات! میں آپ کی توجہ چاہتی ہوں۔ برائے کرم اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے۔ آپ سے آپ کی نئی کپتان مخاطب ہے۔ پی۔ ایف۔ ایل۔ پی کی چے گویرا کمانڈو یونٹ نے ٹی۔ڈبلیو۔ اے کی اس فلائیٹ پر اپنا انتظام سنبھال لیا ہے۔ تمام مسافروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ مندرجہ ذیل احکامات کی پابندی کریں۔

۱ اپنی سیٹوں پر تشریف رکھیں اور خاموش رہیں۔

۲ اپنی حفاظت کے لیے اپنے ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھیں۔

۳ نقل و حرکت کی کوشش نہ کریں کہ اس طرح آپ دوسرے مسافروں کی جان بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔

۴ ہم آپ کی ضروریات کو پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

آپ کے درمیان ایک ایسا مسافر ہے کہ جو فلسطینی بچوں، عورتوں اور مردوں کے بے گناہ قتل اور پریشانیوں کا موجب ہے ہم اُسے فلسطینی انقلابی عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ باقی آپ سب ہماری فلسطینی تنظیم کے مہمانِ عزیز ہوں گے۔ آپ سب کو مذہب اور قومیت کے تعصب سے ماورا، یہ اجازت ہوگی کہ جہاز کے باحفاظت اترنے کے بعد جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں آپ جا سکتے ہیں۔

ہماری منزلِ مقصود ایک دوست ملک ہے اور آپ کی میزبانی دوست بھی کریں گے۔"

میں نے جیسے ہی پیغام پڑھ کر ختم کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز نے مطلوبہ راستے سے مختلف راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔ میں نے غصے سے کپتان سے کہا کہ وہ شرارت سے باز آ جائے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ مسافر اور جہاز بحفاظت منزل پر پہنچ جائیں۔ فوراً جہاز کو صحیح راستے پر لایا جائے۔ اب سلیم نے مجھے یاد دلایا کہ جب سے میں نے مسافروں کو اپنے ہاتھ سر کے پیچھے رکھنے کو کہا تھا۔ اس بات کو کہ پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔

میں نے مسافروں کو فوراً ہدایت دی کہ وہ آرام سے بیٹھیں اور چاہیں تو بے شک شمپین پئیں۔ میں نے ان سے کسی قسم کی تکلیف پہنچنے پر معذرت بھی کی۔ اتنے میں ایک ائیر ہوسٹس نے آ کر کہا کہ بہت سے مسافر انگریزی نہیں سمجھتے اور انہیں نہیں پتہ چلا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ائیر ہوسٹس نے متن کا فرانسیسی ترجمہ کرنے کی رضاکارانہ پیشکش بھی کی۔ میں نے پیغام پھر پڑھا اور مسافروں کو یقین دلایا کہ ہمیں بس ایک مسافر ہی چاہیئے تھا۔ بعد میں پریس میں یہ چھپا کہ ہم جون وار کے بدنام زمانہ اسرائیلی سفیر برائے امریکہ جنرل انزک رابن کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ ہمارا مقصود یہ نہ تھا اگر وہ جہاز میں سوار ہو بھی رہا ہوتا تو میں روم میں ۸۴۰ فلائیٹ پر سوار نہ ہوتی میں نے تمام مسافروں کو سوار ہوتے دیکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ان میں رابن نہیں تھا۔

ایک اسرائیلی عرب صالح المعلّم بھی جہاز میں سوار تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم اس کو پکڑنا اور مارنا چاہتے ہیں کہ وہ بہت خوف زدہ اور حراساں تھا۔ ہماری منتخبہ دہشت پسندی کی ترکیب کا اثر یہ ہوا کہ عام مسافروں کا خوف معدوم ہو گیا اور لوگوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ ہم نے مسافروں کے سامنے پیغام کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں کسی شخص سے عناد نہیں ہے۔ البتہ ہم مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اقدام سے سخت نفرت کرتے ہیں پھر، ہم نے یہ اعلان کیا کہ کسی دوست ملک میں پہنچ کر ہم جہاز اڑا دینا چاہتے ہیں۔ یہ ہم نے دمشق پہنچنے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے اعلان کیا۔

اس دوران میں نے زمین پر ریڈیو کنٹرول سے رابطہ قائم کیا اور یونانی انقلابیوں اور جنوبی یورپ کے لوگوں کو تہنیت کے پیغام بھیجے۔ میں نے اعلان کیا کہ یونانی کرنل ہمارے انقلابیوں کو جیل سے رہا کریں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا حتیٰ کہ ہم مصری ابزرویشن ٹاور کی فضائی حدود میں پہنچ گئے۔ میں کنٹرولر کو اپنی شناخت عربی بول کر کرائی اور کہا کہ مصری عوام کو فلسطینی انقلاب کی مبارک باد دیں۔ میں کہا کہ میں لیڈا

جا رہی ہوں اور اس نے ہنس کر کہا "تم لیڈا جا کر کیا کرو گی"۔ "میں آبائی سرزمین دیکھوں گی"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم دیکھ سکو گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں مجھے یقین ہے" میں نے کہا تو اس نے مجھے خطرات سے آگاہ کرنا چاہا۔ میں نے اس کے چیخنے پر سوئچ آف کر دیا کہ وہ کہہ رہا تھا "او فرنٹ...... او پاپولر.... او عرب فلسطینی...." باقی باتیں بہت دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

چند منٹوں بعد فلسطین کا ساحل دھند میں لپٹا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ جیسے جیسے میں آبائی سرزمین کے قریب ہوتی جاتی، میں محسوس کرتی کہ میرے عشق اور مجھ میں باہمی مقابلہ ہے ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کا۔ میں اپنی محبوبہ کی سمت بھاگ رہی تھی۔ جلاوطنی کے سال یعنی ۱۹۴۸ء میں جذب و سرشاری کی لہروں پر موجزن تھی۔ پھر مجھے اپنا حق یاد آیا اور میں نے پائلٹ کو نیچے اترنے کے لیے کہا اور میں نے عربی مقبوضہ فلسطین میں موجود اپنے ساتھی جلاوطنوں کو مخاطب کر کے پیغام دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی سرزمین کی جانب بہت جلد پلٹیں گے۔ میں نے انہیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی اور اسرائیلی قلعہ کو پاش پاش کر دینے کے عزم کا اعادہ بھی کیا۔ میں نے عربی میں لیڈا ٹاور کو بتایا کہ ہمارا جہاز اترنے والا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پائلٹ نے مجھے بتایا کہ ہمیں کلیرنس کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ مگر میں نے کہا "یہ میری سرزمین ہے۔ یہاں اترنے کے لیے اسرائیلی گدھوں سے اجازت لینا میرے لیے ضروری نہیں ہے۔"

پھر میں نے ٹاور سے انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے کہا "ہم پھر آ گئے ہیں۔ شادیہ ابوغزالہ۔ پھر زندگی میں آ گئی ہے۔ لاکھوں شادیہ یہاں بار بار آئیں گی اور پھر اپنی سرزمین واپس لیں گی۔" اسرائیلی ٹاور خوف سے لرزنے لگی ہو گی جبکہ میں نے کہا کہ ہم جہاز کو ائیرپورٹ پر اڑا دیں گے۔ چند ہی لمحوں میں تین اسرائیلی میراج طیارے افق

پر نمودار ہوئے اور ہمیں زمین پر اترنے سے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے انٹرکام کو ایسے آن کیا کہ مسافر بھی بات چیت سن سکیں۔

میں نے ایک دفعہ پھر اعلان کیا کہ پائلٹ اور اسرائیلی، جہاز اور مسافروں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ ہم ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے اگر احکامات صحیح طریقے پر مانے جائیں۔ ساتھی پائلٹ نے کہا کہ اگر اس کو اسرائیلیوں سے بات کرنے کی اجازت دے دی تو وہ انہیں سمجھائے۔ میں نے اجازت دے دی۔ اس نے کہا: "پاپولر فرنٹ آزاد عرب فلسطینی افراد نے ہینڈ گرنیڈ سے جہاز اڑانے کی دھمکی دی ہے اگر آپ کے میراج طیاروں نے راستہ نہ دیا تو اب تک اسرائیلی ٹاور ہمیں ٹی ڈبلیو اے ۸۴۷ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میں غصے میں آ گئی اور اُسے خاموش ہونے کے لیے کہا۔ سوئچ آف کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جب تک پاپولر فرنٹ عرب فلسطین کہہ کر نہیں پکارو گے تمہاری کوئی بات ہی نہیں سنوں گی۔

چند ہی لمحوں میں اس نے تخاطب بدل دیا اور اب ہم حیفہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پائلٹ نے پوچھا "اب میں کیا کروں" میں نے کہا "ہمیں آبائی وطن، منٹ کا چکر لگانا چاہیئے۔ اب میرے سامنے اپنے باپ کا چہرہ ابھرا اور اس کی آواز آئی، "ہم کب گھر آئیں گے۔ میری ساری دنیا مجتمع ہو گئی۔ میں خاموش ہو گئی۔ میں نے فلسطین کی ہریالی اور پہاڑوں کو دیکھا۔ مجھے نیچے تل ابیب نظر آ رہا تھا۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑی، "ابا! ہم اپنے وطن ضرور لوٹیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت بحال کریں گے۔" پھر یک دم مجھے خیال آیا کہ مشن پر ذاتی جذبات غالب آتے جا رہے ہیں۔ میں نے پائلٹ سے کہا "جاؤ لبنان کہ جہاں میرے لوگ بطور مہاجر رہتے ہیں۔" اسرائیلی جہاز میرا پیچھا کرتے رہے۔ لبنانی سرحد پر وہ غائب ہو گئے۔ میں نے سائپرس سے فضائی رابطہ قائم کر کے ان کے سامراجیت کے مخالف جدوجہد کرنے

والوں کو مبارکباد دی اور جنوبی لبنان میں اپنے لوگوں کو تہنیت کا پیغام بھیجا۔ پائلٹ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "ہمیں بیروت پر اترنے کے لیے کلیرنس کے لیے کہہ دینا چاہیئے۔" میں نے کہا "یہ ایک عرب ملک ہے۔" ہم بیروت پر چکر لگانے لگے تو میں نے پائلٹ کو دمشق جانے کا حکم دیا۔ اس نے اعتراض کیا "وہ ہوائی اڈہ ۷۰۷ بوئنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" میں نے پھر غصے سے کہا "تمہارے خیال میں ہم اتنے غیر ترقی یافتہ ہیں کہ تمہارے بے ہودہ جہاز کو نہیں اتار سکتے۔" پائلٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے مائکروفون لے کر مسافروں سے آخری مرتبہ مخاطب ہو کر کہا "جہاز اترتے ہی جہاز خالی کر دیں۔ خدا کرے شام میں آپ کا وقت خوشگوار گزرے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اچھی لینڈنگ کریں گے۔"

ایندھن کی بتی سرخ نشان دے رہی تھی۔ کپتان نے کلیرنس لی اور جہاز اترنے لگا۔ میں نے پھر کہا "جہاز حفاظت کے ساتھ اتارا جائے۔ کیونکہ اگر میں گری تو ہینڈ گرینیڈ بھی گر پڑے گا اور پھٹ جائے گا۔ یوں ایک اچھے سفر کا بُرا انجام ہوگا۔ اس نے بڑے سکون سے جہاز اتارا اور تین منٹ کے اندر اندر خالی ہو گیا۔ میں نے اور سلیم نے لوگوں کو ذرا آرام سے سامان اتارنے کے لیے کہا بھی، مگر زیادہ خوف زدہ ہو کر بغیر کچھ لیے ننگے پیر ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ حتیٰ کہ جہاز کا عملہ بھی اپنی یونیفارم وہیں چھوڑ گیا۔ جیسے ہی کیپٹن کارٹر باہر آیا، میں نے اُسے سیلوٹ کیا اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا اور پھر کہا "آپ کا شکریہ۔"

میں نے جہاز کا معائنہ کیا۔ سارے مسافر جا چکے تھے۔ سلیم نے کاک پٹ کو تاروں سے جوڑا اور فیوز لگایا۔ میں نے ایمرجنسی کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگائی۔ سلیم میرے پیچھے آیا اور میرے کندھوں پر آ کر گرا۔ مگر جہاز میں دھماکہ نہیں ہوا۔ سلیم کی ذاتی ہمت تھی کہ وہ پھر جہاز میں گیا۔ پھر ہر چیز کو چیک کر کے فیوز لگایا۔ اب

شامی فوج بھی آ چکی تھی۔ میں نے اُن کی توجہ ہٹائی "اُس طرف اسرائیلی فوجی بھاگے ہیں جاؤ انہیں پکڑ کر لاؤ۔" سلیم ابھی جہاز ہی میں تھا۔ مجھے اس کی سلامتی کی فکر تھی۔ میں اس کی بہادری اور بے غرض جذبے کی مداح تھی۔ میں نے خود اندر جانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔ ایک دم سلیم باہر آیا اور بڑے اعتماد سے ہاتھ ہلایا۔ ابھی بوئنگ دھماکے سے نہیں اڑا تھا۔ سلیم نے جہاز کے بازوؤں پر گولیاں چلائیں۔ مگر جہاز میں تو تیل ہی نہیں تھا۔ اس لیے گولیوں سے بھی جہاز میں دھماکہ نہیں ہوا۔ آخر کو جب شعلہ سا لپکا تو ہم فوراً بیس فٹ پرے ہو گئے۔ مسافر اب کوئی آدھا میل پرے جا چکے تھے اور اب جہاز کو شعلوں میں پلٹتا دیکھ رہے تھے۔ دھماکے کی آواز سن کر شامی فوجی پلٹے اور منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ اور بھی حیران ہوئے جب سلیم اور میں نے اپنے ہتھیاروں سمیت خود کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔ الہدف کا فوٹو گرافر کہ جس کو فرنٹ والوں نے پیراشوٹ کے ذریعے اس پورے واقعہ کی فلم کے لیے اتارا تھا۔ وہ یہ سارا منظر دیکھ کر اتنا جوش میں آیا ہوا تھا کہ فلم لیتے وقت وہ کیمرے کا لینز اتارنا بھی بھول گیا تھا۔

ہمارے شامی میزبان ایئر ٹرمینل تک لے کر گئے اور میں نے مسافروں کے سامنے مختصر سی تقریر کی:۔

"خواتین و حضرات! دورانِ پرواز آپ کے تعاون اور مہربانی کا شکریہ! میں کیپٹن شادیہ ابو غزالہ ہوں۔ یہ میرا نام نہیں ہے۔ میرا نام ہے خالدہ۔ شادیہ وہ لافانی عورت تھی جس نے لکھا "عالی ہمتوں کو لوگ نہیں بھلاتے۔ مگر ان کے بارے میں قصے اور کہانیاں، عوام کی میراث ہوتی ہیں"۔ یہ وہ فلسفہ ہے کہ جس کو مؤرخ اور تجزیہ نگار نہیں سمجھ سکیں گے۔ شادیہ کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا کہ پاپولر فرنٹ اور انقلابیوں کی نسل کے لیے اس نے انقلاب کا راستہ بنایا اور متعین کیا۔

میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ شادیہ نبلوس کے علاقے کی ایک فلسطینی عرب خاتون تھی۔ وہ سکول ٹیچر تھی اور پاپولر فرنٹ کا خفیہ سرگرمیوں کی اہم رکن تھی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو وہ اپنے ہی گھر میں ایک دھماکے سے ہلاک ہو گئی کہ وہ اس وقت گھر میں فرنٹ کے لیے ہینڈ گرنیڈ بنانے میں مصروف تھی میں نے ۸۴۰ فلائیٹ پر اس کا نام اس لیے اختیار کیا کہ میں اسرائیلیوں کے مظالم کی داستان کہ جس میں بچے، بڑے، عورت مرد، سبھی ان کی درندگی کا شکار ہوئے۔ آپ کو سنا سکوں جبکہ وہ لوگ ہماری بربریت کی داستانیں بنا بنا کر آپ کو روز سناتے رہتے ہیں۔ ہم ۸۴۰۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ اے فلائیٹ کا رخ اس لیے بدلا کہ اوّل تو یہ امریکی بڑی فضائی کمپنی ہے اور دوسرے یہ کہ یہی فضائی کمپنی اسرائیلیوں کے لیے فضائی ذرائع مہیا کرتی ہے۔ امریکہ، اسرائیل کو سب سے زیادہ امداد دیتا ہے کہ امریکہ تو ہماری تباہی کے لیے انہیں ہتھیار بھی دیتا ہے۔ ان کو ٹیکس سے فری امریکی ڈالر بھی دیتا ہے۔ اور عالمی کانفرنسوں میں اسرائیل کی حمایت بھی کرتا ہے۔ ہم امریکہ کے خلاف ہیں کہ یہ ایک سامراجی ملک ہے اور ہمارا یونٹ چے گویرا کمانڈو یونٹ اس لیے کہلاتا ہے کہ ہم امریکیوں کی چے کو قتل کرانے کی سازش پر لعنت بھیجتے ہیں اور ہم چے کو تیسری دنیا اور انقلاب کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ ہم حیفا میں جہاز اس لیے لے کر گئے تھے کہ میں اور سلیم دونوں حیفا کے رہنے والے ہیں اور ہم ۱۹۴۸ء میں وہاں سے نکالے گئے تھے۔ ہم آپ کو تل ابیب اس لیے لے کر گئے کہ اسرائیلیوں کو جتانا چاہتے تھے کہ جب عرب جارحیت پر اتر آئیں تو تمہارے لیے مدافعت کا راستہ کوئی نہیں بچے گا۔ ہم آپ کو دمشق اس لیے لائے کہ عربوں کی سرزمین کا یہ خطہ دل کی سی حیثیت رکھتا ہے اور شامی لوگ مہربان اور اچھے لوگ ہیں۔ ہمیں یقین ہے۔ آپ کا دمشق میں قیام خوشگوار رہے گا۔ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ آپ واپس جا کر اپنے دوستوں کو بتائیں

گے کہ وہ اسرائیل، مشرقِ وسطیٰ کے جنگی علاقے میں نہ جائیں۔ برائے مہربانی اپنے ہمسائیوں کو بتائیے کہ ہم بھی آپ کی طرح امن پسند اور حفاظت کے ساتھ ملک میں بسنے کے خواہشمند لوگ ہیں۔ امریکیوں کو جا کر بتائیے کہ اگر انہیں جنگ ناپسند ہے اور دوسروں کے استحصال کے وہ مخالف ہیں تو وہ اپنی حکومت کو اسرائیل کی مدد سے کرنے سے منع کریں۔ اپنی حکومت کو یہ بھی بتائیے کہ اسرائیل آنے سے یہ بھی مراد ہے کہ آپ ہمارے حقوق، انقلاب اور امن کا راستہ روک رہے ہیں۔

مظلوموں سے محبت کرنے والوں کو ہمارا سلام"۔

۲۹ اگست ۶۹ء شام ۷ بجے کا وقت تھا۔ میں نے جیسے ہی تقریر ختم کی میں نے دیکھا میرا یونانی دوست ہچکیاں لے رہا ہے اور ایک امریکی عورت اس کو تسلی دے رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے مجھے اپنے بس ساتھی کے طور پر یاد رکھا ہوا تھا کہ نہیں۔ میں اور سلیم، مسافروں کے ساتھ ملنے اور بچوں میں مٹھائی تقسیم کرنے لگے۔ دو بوڑھی عورتیں ایک دوسرے کو دلاسہ دے رہی تھیں۔ ایک کہہ رہی تھی میں بھیگی ہوئی ہوں اور دوسری کہہ رہی تھی شکر کرو دمشق میں زندہ سلامت پہنچ گئی ہو۔ شامی حکومت مسافروں کی کسٹم سے ضروری تلاشی کرا کے ہوٹلوں میں انہیں لے گئی۔ سوائے چھ اسرائیلیوں کے باقی سب کو رہا کر دیا گیا ایک امریکی عورت کو ٹخنے کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ ۳ ستمبر کو ۴ اسرائیلیوں کو رہا کر دیا گیا۔ بعد میں دو اسرائیلیوں کو شامی ہوائی فوج کے پائلٹوں کے تبادلے میں رہا کر دیا۔ مجھے اور سلیم کو پولیس ہیڈ کوارٹرز لے جایا گیا۔

ہر چند ہم جب ائیرپورٹ اترے تھے تو شامی لوگوں کی تالیوں کے شور میں اترے تھے اور شامی افسر بھی بڑی محبت کے ساتھ ملے تھے۔ مگر اب ایک اکھڑ سے کرنل نے پوچھ گچھ شروع کی :-

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تم کیا ہو۔"

"آپ کی طرح سپاہی۔" میں نے کہا۔

"نہیں" وہ غصے سے بولا "تم دہشت پسند تنظیم ہو۔"

"نہیں..... میں اسرائیل میں ہوں کہ شامی عرب جمہوریہ میں کہ جو خود کو انقلابی کہتے ہیں" میں نے غصے سے کہا۔

کرنل کو میرا بات کرنے کا لہجہ اچھا نہیں لگا اور بولا "تمہارا ایکشن، فدائین کی طرح کا نہیں ہے۔ یہ دہشت پسندی کا ہے۔"

"جناب مجھے جو حکم ملا میں نے اس کو پورا کیا ہے۔ اگر آپ ہماری انقلابی تنظیم کی کارکردگی کے لائحہ عمل پر بحث کرنا چاہتے ہیں تو اس پر بحث تو پولیس سٹیشن پر نہیں ہو سکتی۔" میں نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے کہا "تمہاری تربیت کہاں ہوئی ہے۔"

"میں مزید کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی کہ میں اپنا نام اور اپنی پارٹی کا نام بتا چکی ہوں" میں نے مزید کہا۔

کرنل نے ہمیں تاریک چھوٹے کمروں میں بند کرنے اور دو دو کمبل دینے کا حکم دیا۔ رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے۔ ہمیں دوسری منزل میں تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ میں نے اپنا نام خالدہ دیا تھا اور انہیں بالکل پتہ تھا کہ یہ غلط نام ہے۔ افسر انچارج کچھ زیادہ ہی ہوشیار اور چالاک تھا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو ہمارے لیے کھانا لانے کو کہا اور بتانے لگا کہ وہ خود فلسطینی انقلابی تنظیم سے کس قدر مانوس اور متعلق ہے۔ میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے "کرنل کے تو ایسے خیالات نہیں ہیں۔"

"کون کرنل؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو تم کو پتہ ہونا چاہیئے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

اسسٹنٹ کھانا لے آیا۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک رہا نہیں کیا جاتا میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

"اچھا اگر تمہیں رہا کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گی" اس نے پوچھا۔

"اپنے ملک فلسطین۔" افسر نے اور بہت سی باتیں مجھ سے پوچھیں اور میرا جواب تھا کہ "کوئی تبصرہ نہیں۔" رات گئے میں نے غسل خانے جانے کو کہا۔ میرے ساتھ ایک پولیس کا آدمی گیا اور اس نے حکم کے مطابق پہلے میری تلاشی لینی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر تم نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو میں شور مچا دوں گی اور کہوں گی کہ میری عصمت دری کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نے حکم کی پرواہ نہ کی مجھے میرے سیل میں لے آیا۔ میں نے چوکیدار سے سگرٹ خرید لانے کو کہا۔ اس نے انکار کیا اور میں نے پوری رات ایک سگرٹ کو محتاط طریقے پر استعمال کر کے گزاری۔ میں چونکہ نہ سو سکتی تھی نہ کسی سے بات کر سکتی تھی۔ میں نے بھی گارڈ کو ساری رات چکر لگانے پر مجبور رکھا۔ معلوم نہیں صبح کو وہ زیادہ تھکا ہوا تھا کہ نہیں۔ مگر میں نے یہی عمل چار راتوں تک جاری رکھا۔

۳۱ اگست کی صبح کو ناشتہ میرے سیل میں لایا گیا اور میں نے انکار کرتے ہوئے غصے سے کہا کہ میں بھوک ہڑتال پر ہوں ——— میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور میں سگرٹ بھی بہت پی رہی تھی۔ میں اکیلی رہ کر بور بھی بہت ہو رہی تھی۔ مگر مجھے علم تھا کہ میرے کامریڈ میری اس کامیابی پر خوب جشن منا رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت کے درمیان جو لوہے کی پارٹیشن لگی تھی اُسے میں نے مروڑ کر اتنی جگہ پیدا کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھسر پھسر کر سکتے تھے۔ میں نے اُسے ایئرپورٹ پر بھیگی ہوئی عورت کا قصہ سنایا۔ وہ یہ سن کر بہت ہنسا۔ گارڈ نے

ہنسی کی آواز سن کر سمجھا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں اور بھاگا بھاگا آیا۔ مگر مجھے با قائمی ہوش و حواس دیکھ کر گھبرایا اور سوراخ دیکھ کر تو چونکا ہو گیا۔ اس نے مجھے دہشت پسند کہہ کر بُرے نتائج کی دھمکی دی۔ میں نے سوراخ اور چوڑا کر کے کہا " جاؤ بتاؤ اپنے آقاؤں کو"

اس شام ایک اور کرنل ہم سے ملنے آیا۔ وہ سویلین کپڑے ہوئے تھا اور اپنے سے پہلے کرنل سے بہتر عادت کا آدمی معلوم دیتا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں شامی ائیر فورس میں الناصر شعبے میں فلسطینی پائلٹ ہوں اور میرا نام 'اذانی' ہے۔ میں ابھی محاذ سے لوٹا ہوں اور آپ کے لیے مجاہدوں کی جانب سے تہنیت کا پیغام لے کر آیا ہوں"۔

میں نے کہا " اگر تم ہمیں انقلابی کہہ رہے ہو تو ہمیں جیل میں کیوں رکھا ہوا ہے"۔

"تم آخر بھوک ہڑتال کیوں کئے ہوئے ہو" اس نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر، دوسرا سوال کر ڈالا۔

"اس لیے کہ مجھ سے مجرموں والا سلوک کیا جا رہا ہے اور یہ تفتیشی افسروں کے ان تحقیر آمیز رویوں پر سخت احتجاج کرتی ہوں"۔

اس نے کہا " کچھ پیسوں یا کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتایئے"۔

میں نے فخر سے کہا " میرے پاس پیسہ بھی ہے اور سب کچھ بھی۔ مجھے اس غسلخانے نما جیل سے رہائی دلایئے"۔

وہ بغیر کوئی جواب دیئے واپس چلا گیا۔

یکم ستمبر کو مجھے بہت زیادہ کمزوری محسوس ہوئی اور میں تھکی تھکی بھی بہت تھی۔ پیٹ، سر اور بدن میں درد، مجھے بے حال کئے ہوئے تھے۔ مجھے چکر آ رہے تھے۔ مگر میں نے پھر بھی کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ اس شام میں غسلخانے جاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی اور انہیں مجھے ہوش میں لاتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ شامی افسر بہت

مضطرب تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلایا اور اس نے مجھے دہی کھانے کافی پینے یا کچھ بھی تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کیا۔ میں انکار کر کے چلی آئی۔ اس کے بعد مجھے آنا یاد ہے کہ نرس میرا منہ دھلا رہی تھی اور سلیم مجھے ہسپتال کی ایمبولنس میں لے جا رہا تھا۔ میں ۲ ستمبر کی صبح تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئی تھی۔ مگر میرے اندر اطمینان کی لہر تھی اسی لہر نے ہوش میں آنے کے بعد مجھے چے کی تحریروں سے خیالات اخذ کرنے اور اپنے نوٹس لکھتے ہوئے یہ بھی لکھوایا کہ " ہمیں سخت بننا چاہیئے مگر اپنے اندر کی نرمی کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے"۔

کتنا اچھا فقرہ تھا۔ مگر انقلاب کی نرمی اور ملائمت کی روایت اور بھی زیادہ خوبصورت چیز ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس فن کو مؤثر طریقے پر استعمال کیا ہے۔ دوسروں کو میرے کام پر تبصرہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر چند سرمایہ دار ممالک نے میرے کام کو دہشت گردی سے تعبیر کر کے مجھے سخت سے سخت سزا دینے کی سفارش کی تھی۔

" میں دمشق میں کسی مقام پر ہوں۔ اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ میری زندگی کا وہ معجزانہ لمحہ تھا کہ جب میں نے پستول کی بلبلی پر اپنی انگلیاں رکھیں اور دشمنوں کو اپنا حکم ماننے کے لیے کہا۔ ساری عمر میں دشمن پر ہتھیار اٹھانے کا سوچتی رہی۔ وہ دشمن کہ جس نے میری سرزمین کو لوٹا ہے۔

" او فلسطینی! میں تیرے لیے مرنے کو بھی تیار ہوں اور تیری خاطر مر کر بھی جاوداں ہو جاؤں گی"۔

اے میری سرزمین! میرے عشق، میری محبت، میں تیرے دشمنوں کے خلاف بغاوت کروں گی۔ میں اپنے بدن کے ذروں سے بم بناؤں گی اور اپنی روح کے تاروں سے تیرے لیے لباس تیار کروں گی۔

میں اپنی اور اپنی بہنوں کی قوت سے، اپنے وجود کو بموں میں منتقل کر کے

ہم اپنی زمین، پہاڑ اور ساحل۔ سب کچھ آزاد کرائیں گے۔"

اوہ! مجھے لگ رہا ہے کہ میں خود کو فراموش کرتی جا رہی ہوں۔ میں تو ایک شاعر کی طرح لکھتی جا رہی ہوں۔ شاعری بھی انقلاب کا حصہ ہے۔ شاعروں کے کارنامے، ہتھیاروں سے بھی زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

او خدا! ہماری پیاس کب بجھے گی، میں کب اپنے گھر جاؤں گی کہ زندگی کا بھرپور لطف حاصل کر سکوں۔ میں حیفا میں رہوں گی کہ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

ہم نے سی آئی اے کے منہ پر جو طمانچہ مارا تھا، اس پر میں اور سلیم خوش بھی تھے کہ اتنی بڑی طاقت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ اب امریکہ چاہے تو اسرائیل کو سارے ہتھیار دے دے۔ میرے لوگ پھر بھی زندہ رہیں گے۔ میں دیکھ رہی ہوں اور اب کوئی مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتا ہے۔ میرے لوگوں کو سامراجی اور صیہونی دشمنوں نے آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔

مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب میں پائلٹ کے کیبن میں داخل ہوئی تھی۔ کیپٹن مجھے دیکھ کر کیسے کانپ اٹھا تھا۔ کیسے حکم برآری کے فقرے اس کے منہ سے ابلے پڑتے تھے۔ "بہت اچھا جناب۔ جو آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔ فرمائیے اب میں کیا کروں؟"

وہ میرا کام دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے امریکہ اور اسرائیل پر دل ہی دل میں ہزار مرتبہ لعنت بھیجی ہوگی۔

"کیسا جذباتی موقع ہوتا ہے جب ہر ایئر ٹاور کو مجبور کر دو کہ وہ آپ کا نعرہ نشر کرے" پاپولر فرنٹ۔ آزاد عرب فلسطین"۔

"پائلٹ نے سب سے پہلے ہمارا نعرہ فضا میں بلند کیا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں یہ ادا کیا تھا۔ وہ ایک اوسط درجے کے امریکی خاندان کا فرد ہے کہ

جسے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر خود سے پیار کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خود غرضی امریکی خاصیت ہے جو کہ خود کو اور واضح کرتی ہے جب امریکی اجتماعی طور پر کامیاب قیادت سے محروم ہوں، مجھے یاد ہے کہ وہ کس طرح جاپان سے دوڑے تھے اور کس طرح مشرق بعید میں ان کے قدم اکھڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پائلٹ کے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ خود کو امریکہ کی خاطر قربان کر دے گا"۔

"میرے لیے وہ کتنا شاندار لمحہ تھا۔ جب میں دشمن کے جہاز میں آبائی سرزمین پر سے گزری۔ او میرے خدا! وہ کتنی خوبصورت سرزمین ہے۔ میرا تو دشمن کے ہاتھوں اپنی سرزمین پر مر جانے کو جی چاہ رہا تھا تاکہ میں ساری عمر اس خاک کے ذروں میں اپنا وجود دبا دوں۔ مگر میری انقلابی شرافت نے مجھے ذاتی خواہش کو قربان کر کے ان بچوں کو تحفظ دینے پر مجبور کیا۔ جنہوں نے میری قوم سے کوئی غداری یا میری قوم کے خلاف کوئی جرم سرزد نہیں کیا ہے"۔

اب مجھے وہ لمحہ یاد آ رہا ہے جب میں نے مصری عوام سے فضائی رابطہ قائم کیا۔ جب میں نے لیڈا کا تذکرہ کیا تو مصری جمعو نے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔ تم وہاں کیا کرنے جا رہی ہو۔" ہم دیکھنے جا رہے ہیں۔" اے میری سرزمین۔ میں تیرے لیے سب کچھ یاد کر رہی تھی"۔

۴ ستمبر کو ہمیں پتہ چلا کہ شامیوں نے ۴ اسرائیلیوں کو رہا کر دیا تھا جبکہ میں اور سلیم ابھی قید میں تھے۔ میں غصے میں بہت بولی۔ نرسوں نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش کی کہ اگر میں رہا ہونا چاہتی ہوں تو کچھ کھاؤں۔ میں نے کھانے کا وعدہ کیا اگر وہ مجھے اخبار اور ریڈیو لا دیں۔ انہوں نے وعدہ کیا اور یوں مجھے اپنی تکلیف کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی کہ میں نے ریڈیو کھولتے ہی پائلٹ کی زبانی جہاز کے اغوا کا قصہ سنا۔ چند لمحے بعد شامی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل مصطفیٰ طلاس میرے

کمرے میں داخل ہوئے اور میرے کارنامے کو انتہائی احمقانہ قرار دیتے ہوئے مجھے یو۔ اے۔ آر کا ایجنٹ قرار دیا۔ یہ بھی کہا کہ جہاز اغوا کر کے دمشق لانے سے میری مراد یہ تھی کہ شامی حکومت بدنام ہو، مصری حکومت اور صدر ناصر کو پراپیگنڈے کا ایک اور آئٹم مل جائے۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ فرنٹ خود مختار ادارہ ہے اور ہم کسی سے احکام نہیں لیتے ہیں۔ اب میں نے اسرائیلیوں کی رہائی کا سوال اٹھایا تو انہوں نے کہا کہ "تم شام کی قیدی نہیں ــ مہمان ہو۔"

"میں کسی بھی ملک یا شخص کی مہمان بننا نہیں چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے ملک، کام کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔" ساتھ ہی میں نے یہ درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو صدر عطاس کے ساتھ میری ملاقات کرا دی جائے۔ انہوں نے بتایا کہ صدر تو مصر گئے ہوئے ہیں اور معلوم نہیں کہ کب واپس آئیں۔

جنرل کے جانے کے بعد مجھے اور سلیم کو ایک ایسے گھر میں لے جایا گیا جہاں چار آدمی اور بھی تھے۔ ہم نے یہ تجربہ کیا تھا کہ ہم جس قدر برہم ہو کر بولتے ہیں۔ شامی اسی قدر ہم سے نرم برتاؤ شروع کر دیتے ہیں۔ ہم نے آتے ہی پوچھا کہ ہمیں کتنے دن تک وہاں رکھا جائے گا اور آخر کیوں رکھا جا رہا ہے؟ کوئی جواب نہ ملا۔ پر اسی رات کوئی دس بجے کرنل علی زازا (حافظ الاسد کی حکومت میں وہ وزیر داخلہ ہیں) دو سیگا کمانڈوز کے ساتھ آئے۔ سیگا دراصل شامیوں کی مزاحمتی فوج کا نام ہے وہ مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔ اگلے چار گھنٹے تک ہم نے مزاحمتی تحریک، فتح کے کردار، فلسطینی نیشنل کانگرس اور اس کی اقدار، سوشلزم کی صورت اور دیگر عوامل پر بحث کی۔ ظاہر یہ ہوا کہ سیگا، شامی باتھ کی ہی ایک شاخ تھی۔ ہر چند ہمارا چند نکات پر اتفاق ہو گیا مگر ہم نے یہ محسوس کیا کہ شام کی موجودہ حکومت، سائنسی سوشلزم کی بجائے بائیں بازو

کے باتھزم پر یقین رکھتی تھی۔

۴ ستمبر کو تو ہم بہت فیشن ایبل اور باعزت ہو گئے تھے۔ رؤسا کے خاندان کی ۴ خواتین مجھ سے ملنے آئیں اور پھول پیش کئے۔ ان میں سے تین نے خود کو شامی، لبنانی اور فلسطینی عورتوں کی انجمن کے نمائندے بتایا اور چوتھی نے خود کو فتح کی نمائندہ بتایا۔ میں نے ان سب کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ایک انقلابی مشن مکمل کرنے والی کے لیے کیا پھولوں کا تحفہ لانا چاہیئے۔ وہ میرا ردِ عمل دیکھ کر پریشان سی ہو گئیں۔ ان میں سے ایک نے تو فرنٹ کی کارکردگی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اس مشن کا مطلب تو الاقصیٰ کو آگ لگانے کے حادثے کو پسِ پشت ڈالنا تھا اور اس وقت صرف الاقصیٰ کا حادثہ ہی مسلمانوں کو یکجا کر رہا تھا۔

میں نے سمجھایا کہ ہمارے جہاز اغوا کرنے سے صرف ایک ہفتہ پہلے الاقصیٰ کا حادثہ ہوا تھا اور اس کا ہمارے مشن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر میں نے کہا کہ ہم تو مذہبی اتحاد کی بات ہی نہیں کرتے۔ ہم تو سامراج دشمن پلیٹ فارم پر سب کو لانا چاہتے ہیں۔ میرے مہمانوں کو میری یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے کہا کہ انقلاب کا یہ نیا فلسفہ کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ کر سکے گا اور وہ چاروں کی چاروں غصے میں میرے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

۴ ستمبر کی شام میرے لیے اداسیاں لے کر آئی۔ اس شام ایک عظیم انقلابی ہوچی منہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ خبر میرے اوپر بجلی بن کر گری۔ مجھے لگا جیسے میرا ایک حصہ مر گیا ہو۔ میرے اندر چے کی وفات کے وقت کا زخم ہرا ہو گیا۔ میں ساری رات اس عظیم شخص کے کارنامے یاد کرتی رہی اور اس بات پر غور کرتی رہی کہ فلسطینی اس سے کیا سیکھ سکتے ہیں۔ دوسری صبح میں نے اٹھ کر نظم لکھی۔

---

(۲)

اگلے پانچ ہفتوں یعنی ۵ ستمبر سے ۱۱ اکتوبر تک مجھے اور سلیم کو مختلف مہمان خانوں میں رکھا گیا۔ شامی مجھ سے یا سلیم سے خوف زدہ نہیں تھے بلکہ وہ فرنٹ اور اس کے بہادرانہ کارناموں سے خوف زدہ تھے۔ انہیں یاد ہوگا کہ جب انہوں نے ڈاکٹر حبش کو ۱۹۶۸ء میں قید کیا تھا، تو فرنٹ کے لوگوں نے کس طرح معہ شامی پہریداروں کے، ڈاکٹر حبش کو اغوا کرا لیا تھا۔ شامیوں کو اب پھر ایسے حادثے کے دہرائے جانے کا خطرہ تھا۔ بلکہ ہمارا تو قید میں رہنا ایک ایسی حکومت کو آئینہ دکھا رہا تھا جو خود کو کہتی تو انقلابی ہے اور اعمال رجعت پسندانہ ہیں۔ ویسے بھی اب شامی حکومت ہمارے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کرنے لگی تھی۔

وہ ہمیں ایئرپورٹ لے کر گئے اور بوئنگ ۷۰۷ کی تصویریں بنانے کی اجازت دی۔ پھر انہوں نے ہماری شکست کا سب سے قابلِ نفرت نشان بلودان پیلس بھی دکھایا جہاں سے کہ ۱۹۳۶ء میں عام ہڑتال ختم کرنے کی تحریک عرب رہنماؤں نے شروع کی تھی۔ یہ وہ عمل تھا جس نے فلسطینیوں کی تقدیر پر مہر لگا دی تھی اور برطانوی اور صیہونی قوتوں کو موقع دیا تھا کہ وہ اپنے علاقوں سے انقلابیوں کا

صفایا کر دیں۔

ہمیں مہمانوں سے بھی ملنے کی اجازت مل جاتی۔ مگر ہمیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تنہائی محسوس کرنے کے علاوہ جذباتی اس بات پر ہوئی کہ میں عرب جیل میں تھی۔ میں نے اس جذباتی کیفیت کو تحریر میں منتقل کیا۔

"جب آدمی صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے
تو کس قدر آزردہ ہو جاتا ہے۔
جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ دنیا کا تیسرا کھونٹ ہے۔
زندگی کتنی بے مزہ ہو جاتی ہے۔
جب آدمی کو احساس ہو کہ یہ عنصر اب ختم ہونے کو ہے۔
اے میری روح! میں تیری انقلابی خصلت سے اس وقت نفرت کرتی ہوں
جب میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔
اے میری روح! میرے اوپر رحم کر
میں تیری غلام رہی ہوں
میرے اندر ایک عجیب جذبہ۔ بچپنے کی کیفیت سر اُٹھا رہی ہے۔
مجھے محبت چاہیئے۔ محبت ــ محبت۔
میں اس خواہش کا سر کچل دوں گی۔
مگر میں محبت کی آواز سننے سے گریز کیسے کروں۔
میں اپنے محبوب سے بغلگیر ہو کر سو جاؤں گی۔
میں اپنی انسانیت سے جا ملوں گی ــ فلسطین سے جا ملوں گی۔"

۱۱ اکتوبر کو میں اور سلیم اس وقت کے شامی وزیرِ دفاع سے ملے (اب وہ صدر حافظ الاسد ہیں) ہم نے گھر محبوسی میں ۲۵ دن گزارے تھے۔ میں نے اپنے

دمشق کے قیام کو نقصان قرار دیا۔ الاسد نے سرکاری پالیسی اور ہمارے آرام کا خیال رکھنے کی وضاحت کی۔ جب میں نے کہا کہ ہمیں شامی ہاتھ نے قیدی کیوں بنایا ہوا ہے تو وزیرِ دفاع نے وضاحت کی کہ شام پر بہت سخت دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ یا تو ہم تم لوگوں پر مقدمہ چلائیں یا پھر اس ملک کے حوالے کر دیں جس کے خلاف تم نے یہ جرم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں دباؤ ناخوشگوار تھے۔ انہوں نے ہماری دبے الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام شامی انقلاب کو تہ تیغ کرنے کے لیے مغربی انٹیلیجنس کا معلوم دیتا ہے۔ اس پر میں نے برہم ہو کر کہا کہ تم لدیار عرب انٹیلیجنس کو کہاں اتنی توفیق کہ ایسے مشن کا سوچ بھی سکیں۔ علاوہ ازیں عرب انٹیلیجنس کو عرب ریاستوں کے مابین اختلافات اور مفاہمت کے نکتوں کا بھی علم نہیں۔ وہ کیا کر سکیں گے۔ اب حافظ الاسد نے پوچھا "آخر آپ شام میں آئے کیوں"؟ میں نے کہا کہ اوّل تو ہمارے پاس ایندھن ختم ہو رہا تھا اور پھر چاہے ہم مصر میں اترتے یا شام میں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ آپ آخر دونوں ہی ترقی پسند عرب ریاستیں ہیں۔"

وزیرِ دفاع کو میرا لفظ "ترقی پسند" اچھا نہیں لگا۔

میں نے انہیں یاد دلایا کہ کرنل زازا نے ہماری صدر سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر حافظ الاسد نے کہا "خالدہ تم جانا چاہو تو آزاد ہو"۔ میں اور سلیم یہ سن کر منٹوں میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب اسد نے کہا کہ چند روز اور ٹھہرو۔ مگر ہم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ۴۵ دن کا قیام بہت ہے۔ اب تو آپ سے اگلی دفعہ فلسطین کی جنگ کے محاذ پر ہی ملاقات ہوگی۔

سلیم شام کے علاقے حمص میں اپنے والدین سے ملنے گیا۔ میں لبنان واپس آگئی پتہ چلا کہ میرے بھائی ولید کو لبنانی مسلح پولیس نے مارا ہے کہ میں جہاز کے اغوا میں شریک تھی پھر میں عمان آگئی اور وحدت کیمپ میں اپنا کام شروع کر دیا۔

اردن میں امریکہ

(۱)

ادھر میری ذاتی کوششیں فلسطینی عوام کی آزادی کے لیے جاری تھیں اور ادھر بڑی طاقتیں مشرقِ وسطیٰ پر اپنا امن مشن ٹھونسنے کی کوششوں میں معروف تھیں۔
یو۔این کی امن قرارداد ۲۴۲ پر عملدرآمد کرانے کے لیے سیکرٹری جنرل یوتھانٹ نے ڈاکٹر جارنگ کو اپنا ذاتی نمائندہ نامزد کیا۔ ڈاکٹر جارنگ نے اپنا ہیڈ کوارٹر قبرص کے شہر نکوسیا میں دسمبر ۶۷ء میں قائم کیا اور قاہرہ، بیروت، تل ابیب اور عمان سے رابطہ قائم کرکے یوتھانٹ کو اپنی تفتیش اور چھان بین کی رپورٹ دی۔ یوتھانٹ نے گاہے بگاہے غیر یقینی اور غیر ذمہ داری کے بیانات یو۔این میں دیئے۔ جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ ڈاکٹر جارنگ کو اپنا مشن جاری رکھنا چاہیئے تاکہ فریقین میں مصالحت کی کوششیں جاری رہیں۔

ڈاکٹر جارنگ نے دنیا کے گرد چکر لگانے ۹ اپریل تک جاری رکھے، حتیٰ کہ ان کے مشن وقت پر ختم کر دیا گیا تاکہ چاروں بڑی طاقتوں کو سوچنے کا مزید وقت دیا جا سکے اور ان کا فیصلہ تھا کہ باہمی افہام وتفہیم اور وہ بھی امریکہ اور روس کی بات چیت کے ذریعے یو۔این کی نگرانی میں فیصلے پر عملدرآمد کرایا جائے۔ ہمارے وجود کا سوال

اور اس سے انکار کا مسئلہ یو۔این کی راہداریوں سے اٹھا کر بڑی طاقتوں کی افہام وتفہیم کی منہ بند تھیلیوں میں ڈال دیا گیا۔ عرب رہنماؤں نے اس ٹھونسے گئے فیصلے کو تسلیم کیا تاکہ وہ کہہ سکیں کہ بڑی طاقتوں کی خواہش اور فیصلے کو رد کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی کہ ساری دنیا کو آپ اپنی انگلی کی نوک پر نہیں نچا سکتے ہیں۔

اسرائیل کو احساس ہوا کہ چاروں طاقتوں کی بات چیت متعصبانہ تھی کیونکہ اول تو بات چیت پر اسرائیل کو کوئی اختیار نہ تھا۔ دوسرے اسرائیلیوں نے سوچا کہ ان کو اسرائیل کے خلاف ہی استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دو طاقتیں یعنی سوویٹ یونین اور فرانس، اسرائیل کی پوزیشن کے بارے میں جارح رویہ رکھتی تھیں۔ البتہ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے سے متعلق تمام پارٹیاں ۱۹۶۹ء کو عرب' اسرائیل جھگڑا ختم کرنے کا سال بنانا چاہتی تھیں۔ ان کو خوف تھا کہ اس سے پہلے کہ عرب ممالک اور اسرائیل کے لیے یہ گوریلے خطرہ بن کر ابھریں۔ یہ مسئلہ مزید نہ بڑھایا جائے اور ممکنہ حل پیش کر دیا جائے۔ فلسطینیوں کا غصہ کم کرنے کے لیے فلسطین کے وجود کا غبارہ بھی فضا میں اڑا دیا گیا۔ امریکہ اور اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں اس غبارے کی ملکیت قبول کرنے والا تلاش کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر ناکام رہے۔

جیسے جیسے مزاحمت گرفت حاصل کرکے عرب عوام میں سرایت کرتی گئی۔ یو۔این اور بڑی طاقتوں کے مابین مذاکرات کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ چاروں طاقتوں کے مذاکرات دو طاقتوں کے باہمی مذاکرات بن گئے اور پھر امریکہ اور روس اپنی اپنی دکانداری اور اپنے موکل کی طرفداری کا فریضہ سرانجام دینے لگے۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ امریکہ، سوویٹ اور عرب صلاح کے بعد فیصلہ کار کی حیثیت سے کام کرے گا۔ اسی نتیجہ خیزی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۹ دسمبر ۱۹۶۹ء کو راجرز تجاویز سامنے لائی گئی تھیں۔
راجرز تجاویز کا مطلب تھا کہ توقع کی جاتی ہے کہ عرب' اسرائیل جنگ کے ۱۹

سالوں کا خاتمہ دائمی امن کے قیام کی کوشش کی شکل میں ہو جائے گا کہ پہلے ایسی توقعات وابستہ ہی نہیں کی گئی تھیں۔ چونکہ مشرقِ وسطیٰ کسی بھی سیاسی گتھلک کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے امریکہ نے سوچا ہے کہ جنگ کے امکانات ختم کرنے، شبہات دور کرنے اور سیاسی حل تلاش کرنے کے لیے قوت صرف کی جائے۔

راجرز نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ امریکہ کا براہِ راست واسطہ اور توقعات سوویٹ یونین کے ساتھ تھیں۔ راجرز نے مذاکرات کے لیے چار اہم عناصر کو زیرِ نظر رکھنے پر زور دیا تھا۔

۱ کہ جو اقوام براہِ راست کسی معاملے سے متعلق نہ ہوں۔ وہ دائمی امن کے قیام کی کوششوں میں ناکام رہتی ہیں۔ یہ تو براہِ راست طاقتوں اور پارٹیوں کے مفادات سے ٹکراؤ یا افہام و تفہیم کی بات ہوتی ہے۔ بڑی طاقتیں تو متعلقہ پارٹیوں کو مذاکرات پر آمادہ کر سکتی ہیں۔ حوصلہ افزائی کر سکتی ہیں مصالحتی فارمولا پیش کر سکتی ہیں مگر اس کا براہِ راست اطلاق یا ممکنات تو متعلقہ پارٹیوں ہی پر منحصر ہوتا ہے۔

۲ کہ دائمی امن، متعلقہ پارٹیوں یا ممالک کا براہِ راست مسئلہ ہے۔

۳ کہ یونین کی قرارداد مکمل، باہمی مذاکرات کے بعد تیار شدہ اور جنگ کے خاتمے کی حتمی کوشش ہے۔

۴ جنگ کی طوالت کسی کے لیے سود مند نہ ہو گی اور مشرقِ وسطیٰ کے بحران کو بڑھائے گی۔

راجرز نے عربوں سے اپیل کی کہ وہ دائمی امن کے اس مصالحتی فارمولے کو مان لیں اور اسرائیلیوں سے مقبوضہ علاقے خالی کرنے اور سیکورٹی کونسل کی قرارداد پر عمل پیرا ہونے کی اپیل کی۔ علاوہ ازیں جارحیت پر مبنی ہر قسم کی کارروائی

ختم کرنے کو بھی کہا گیا۔

راجرز کی تقریر پر اسرائیل میں شک و شبہات نے جنم لیا اور وزیرِ اعظم گولڈا میئر نے اسے اسرائیل کے تحفظ کی راہ میں بڑے خطرے سے تعبیر کیا۔ امریکہ میں ہمفرے نے اس تجویز کو اسرائیل کی دوستی اور مفادات قربان کر دینے کا عمل قرار دیا۔ چونکہ اسرائیل نے راجرز تجاویز کو عرب مفادات سے متعلق قرار دیا تھا۔ امریکہ میں صیہونیوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ امریکہ کی چوبیس صیہونی تنظیموں نے واشنگٹن میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۰ء کو جمع ہو کر امریکہ کی مشرقِ وسطیٰ کی پالیسی کے سلسلے میں سخت ناگواری کا اظہار کیا اور نکسن پر بھی غصہ نکالا جانے لگا۔ امریکہ نے فوری ردِ عمل کے لیے اسرائیل کے ساتھ براہِ راست روابط کا اظہار کیا اور امریکی صدر نے اپنے ذاتی دوست صیہونی صنعت کار میکس فشر کو صیہونی عمائدین کے سامنے پیغام پڑھنے اور دینے کو بھیجا۔ مسٹر فشر نے بتایا کہ ایک ہزار سے زائد صیہونی تنظیموں اور اداروں کے راہنماؤں نے کہا کہ "امریکہ اپنے دوستوں کا ساتھ دیتا ہے اور اسرائیل اس کا دوست ہے۔ اس نے مزید کہا کہ امریکہ اسرائیل کو فوجی اسلحہ بھی دینے کو تیار ہے۔ علاوہ ازیں امن کے امکانات مزید روشن ہیں کہ اس علاقے کی حکومتوں کی سرحدیں محفوظ اور عوام پُر امن ہیں۔ البتہ دائمی امن عربوں اور اسرائیل میں باہمی مصالحت کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اسرائیلیوں کو مزید ۲۴ فینٹم جہاز دیئے گئے۔"

اسی دوران ۸ دسمبر ۶۹ء کو اسرائیل اور اردن میں علیحدہ علیحدہ امن کی تجویز پیش کی گئی۔ یہ بھی بڑی طاقتوں کی نگرانی میں بنی تھی۔ امریکی تجاویز کو سامنے رکھتے ہوئے دو حقیقتوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ شام جس کی گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کے قبضے میں ہیں۔ اس کو بڑی طاقتوں نے اپنی بحث ہی سے خارج کر دیا ہے۔

اور یہ کہ اردن پر لازم آتا ہے کہ تجاویز پر عملدرآمد تک مزاحمتی تحریک کو کچل دے گی۔ گیارہ نکاتی امریکی منصوبہ اس طرح سے تھا:۔

۱ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اردن کے تمام مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی افواج مقررہ شیڈول کے مطابق واپسی کا منصوبہ مکمل کریں گی۔

۲ ہر ایک ملک ہر دو کے درمیان امن کی سلامتی کا تحفظ کرے گا اور کسی قسم کے دہشت پسندی کے اقدام کو معیوب بلکہ ممنوع قرار دے گا۔ اردن گوریلا سرگرمیوں پر پابندی لگائے گا۔

۳ دونوں ممالک ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی سرحدوں کے بارے میں بہ لحاظ باہمی افہام وتفہیم ردوبدل بمطابق انتظامی اور معاشی آسانیاں کر سکیں گے۔

۴ اسرائیل اور اردن یروشلم کے بارے میں قطعی کنٹرول کا تنازعہ طے کریں گے۔

۵ اسی طرح اسرائیل اور اردن غازہ کے علاقے کا فیصلہ، اسرائیل اور مصر کے فیصلے کے متوازی اور اس پر بنیاد رکھتے ہوئے طے کریں گے۔

۶ اسرائیل کے انخلاء کے حوالے سے اردنی مغربی کنارے کے علاقوں کے تحفظ کے بارے میں دونوں ممالک باہمی مشاورت سے کام لیں گے۔

۷ اردن، تیران اور عقابہ کی خلیج تمام ممالک معہ اسرائیل کی جہاز رانی کے لیے کھول دے گا۔

۸ ڈاکٹر جارنگ ایک بین الاقوامی کمشن بٹھائیں گے جس کے مطابق ہر مہاجر سے اسرائیل میں آبادکاری کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائے گی۔

۹ دونوں ممالک معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی خودمختاری، سرحدی تحفظات سیاسی آزادی اور امن سے زندہ رہنے کا حق تسلیم کریں گے۔

۱۰ مکمل معاہدے کی توثیق یو۔این کی سکیورٹی کونسل اور چاروں بڑی طاقتیں کریں گی۔

۱۱ پورا معاہدہ، دستخط ہونے کے بعد اقوام متحدہ میں جمع کرایا جائے گا اور اس کا کسی بھی ملک سے مواخذہ یا خلاف ورزی، دوسرے ملک کو بھی منسلکہ ذمہ داری سے آزاد کر دے گی۔

اور آخر میں امریکہ کا خیال تھا کہ اسرائیل۔اردن معاہدۂ امن کے فوری طور پر پابند ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ مصر۔اسرائیل سمجھوتہ بھی روبہ عمل ہوگا۔ ان معاہدوں کا مطلب عرب دنیا کو تقسیم کر کے، امن کی کوششیں نہیں ہے (یہ وضاحت خود امریکہ نے کی)

اوپر نکات، امریکہ کے واضح مقاصد کو آئینہ دکھانے کے لیے دیئے گئے ہیں۔ امریکہ مشرق وسطیٰ میں پائیدار اسرائیل اور اس علاقے میں غیر متعلق سوویٹ یونین کو دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ علاوہ ازیں عربوں کو ذاتی دشمنیوں کے چکر میں ڈال کر ملٹری ڈکٹیٹرشپ اور بادشاہتوں کو آپس میں لڑوا کر، اپنے مفادات کا تحفظ امریکہ کی خواہش ہے۔ علاوہ ازیں اس مجوزہ امن منصوبے کا بنیادی مقصد غیر فلسطینی مختاری کے تصور کو فروغ دینا ہے کہ ایک فلسطینی صوبہ بنا دیا جائے جو یا تو اردنی حکومت کے ماتحت ہو کہ اسرائیل کی نگرانی میں۔

ان تجاویز کے سلسلے میں الزامات، جوابی الزامات کبھی سوویت یونین کی طرف سے اور کبھی عرب ریاستوں کی جانب سے، عرب عوام کی رائے کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے لگائے جاتے رہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ مصر اور اسرائیل، اپنی حاکمیت برقرار رکھتے ہوئے ان تجاویز کو روبہ عمل کیسے لائیں کہ بڑی طاقتیں بھی ناراض نہ ہوں۔

اسی کشمکش کے نتیجے میں موسم خزاں ۱۹۶۹ء اور موسم سرما ۱۹۷۰ء میں ناصر کی حکومت کے تختہ الٹنے کے اسباب سمجھے جا سکتے ہیں۔ بڑی طاقتیں، ہر چند بیچ اور سمجھوتے کے رویے کے حق میں تھیں جبکہ اسرائیل کا سارا زور اور اصرار، امریکی

حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ آخر کو روسیوں نے مصر کو وہ میزائل دیئے جو اسرائیلیوں
کو مصر میں اندر داخل ہونے سے روک سکتے تھے۔ ساتھ ہی پراپیگنڈے کا یہ عنصر
بھی فروغ دیا کہ اسرائیلی اسلحہ کے مقابلے میں مصر کو سوویٹ اسلحہ، توازن قائم کرنے
کے لیے دیا جائے۔ امریکی تو پہلے ہی اسرائیلیوں کی حمایت سے شرمسار نہ تھے۔ انہوں
نے عالمی سطح پر یہودی پراپیگنڈے کو وسعت دیتے ہوئے یہ بھی مشہور کیا کہ ہزاروں
روسی ماہرین اور پائلٹ، مصری ملٹری قوت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ادھر سوویٹ یونین
نے نہ صرف مصر کو مطلوبہ ملٹری قوت دینے سے انکار کیا کہ جس کے توسط سے مقبوضہ
علاقے کو آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ بلکہ وہ بنیادی اسلحہ بھی فراہم نہ کیا کہ جس کے باعث
مصر کھلے صحراؤں میں اپنے ان سٹیشنوں کی حفاظت کر سکتا کہ جن کا قیام ہی سوویٹ،
مشورے کے باعث عمل میں آیا تھا۔ علاوہ ازیں نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے کر
استعمال کرنے کی مصری تحریک کو امریکی اور اسرائیلیوں نے اس علاقے میں امریکی
قوت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ مصر کسی وقت بھی نہ اسرائیلی فوجی قوت کے
لیے خطرہ بنا نہ نہر سویز پار کرتے ہوئے اور استعمال کرتے ہوئے اس سمت دھیان
دیا۔ البتہ یو۔ اے۔ آر کے فضائی علاقوں میں بے کار گھومتے اسرائیلی جہازوں کو
روکنے کی پیش بندی ضرور کی۔ یہ بات بھی موشے دایان اور اس کے امریکی پروردگان
کو پسند نہ آئی۔

ناصر کی اب کل سیاسی کارکردگی اپنا اقتدار محفوظ کرنے کا لائحہ عمل تھا نہ کہ مقبوضہ
علاقے کو آزاد کرنے کی جستجو، مگر ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ فلسطین صرف اسلحہ کی قوت
کے بل بوتے پر آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صیہونیوں کے انتظام میں فلسطین
کے قیام بمطابق ۴ جون ۶۷ء کو قابلِ عمل تصور کرتا تھا۔ سیاسی صورتِ حال کو وہ
انہی حوالوں سے بیان کرتا۔ البتہ وقتاً فوقتاً عربوں کی جذباتی تسکین کے لیے نعروں

سے بھرپور تقریر کر دیا کرتا تھا۔ اسی دوران عالمی طاقتوں کے نمائندوں کی خفیہ
سرگرمیاں جاری رہیں اور آخر "انصاف کے تقاضوں" کو پورا کرتے ہوئے
حسین نے ایک دوستانہ معاہدے پر دستخط کئے کہ جو راجرز پلان کے تحت اسرائیل
اردن امن معاہدہ اور مزاحمت کو ختم کرنے کا منصوبہ روبہ عمل لانے کا منصوبہ تھا۔

ادھر یہ سیاسی شعبدہ بازیاں جاری تھیں۔ اُدھر میں خلیج عرب اور عراق کے
کے علاقوں کے دورے پر تھی۔ میرے ساتھ بہادر انقلابیوں کی ایک ٹیم تھی جس
میں صالح صالح کہ جو گریجویٹ تھا اور مزدور رہنما تھا۔ رشیدہ عبیدہ جس کے
خفیہ کارناموں سے دشمن سخت خوف زدہ تھا۔ سلیم عیسادی۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ اے
شہرت یافتہ طلعت، وہ انقلابی جو صیہونی یورپ میں ۱۳ سال تک دہشت پسندی
کی سرگرمیاں کامیابی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس دورے کا مقصد زیادہ سے
زیادہ لوگوں کی تعلیم اور فرنٹ کے لیے پیسے جمع کرنا تھا۔ ہمیں کامیابی بھی ہوئی۔ عرب
عوام سے ملے۔ ان کی خواہش کا بھی علم ہوا کہ وہ اپنے علاقوں سے برطانوی لوگوں
کے فوری انخلاء کے خواہشمند تھے۔ علاوہ ازیں وہ امریکیوں کے بڑھتے ہوئے
رسوخ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ہمارا استقبال غریب مزدور اور کسان کر رہے
تھے نہ کہ اس علاقے کے تیل کے بادشاہ یا سیاسی شعبدہ باز۔ ہم فروری کے اوائل
میں عمان آ گئے کہ جوابی انقلاب کی سازش کے بھنور میں ہم بھی پھنس گئے تھے۔

شاہ حسین، فرنٹ لائن ریاستوں کے وسیع دورے کے بعد قاہرہ سے
ابھی پہنچے ہی تھے۔ وہ کچھ جنگجویانہ کیفیت کی سرشاری میں یہ بیان دے گئے کہ
اگر اسرائیل قرارداد ۲۴۲ پہ عملدرآمد نہیں کرے گا تو سخت نتائج بھگتے گا۔ ساتھ
ہی ایسے شدید اقدامات کئے کہ جن کے نتیجے میں تمام بڑے شہروں سے مزاحمتی مراکز
ختم کر دیئے گئے۔ ان کے اخبارات سیل کر دیئے گئے اور ان کے عوامی اجتماع

ممنوع قرار دیئے گئے۔

اب ہم نے سب سے پہلے ان ممنوعات کی خلاف ورزی کرنے ... کا فیصلہ کیا۔ میرے سپرد زرقا کے نزدیک شولر کیمپ تھا۔ مجھے اس کیمپ میں شاہ ... کے خلاف تقریریں کرنے اور عوام کو یہ بتانے کا حکم تھا کہ حسین کا یہ قدم امریکہ اور اسرائیل کے اقدامات سے الگ نہیں تھا۔ ہمارے کامریڈ یہی پیغام لے کر اردن کے تمام کیمپوں میں گئے۔ حسین نے بدلہ اس طرح لیا کہ کیمپوں میں پانی اور بجلی منقطع کرا دی۔ یہی عمل اس نے غریبوں پر ستمبر میں بھی دُہرایا۔ ہم نے حسین کے ان اقدامات کو چیلنج کیا اور تمام اردن میں مظاہروں کی اپیل کی۔ اس کے ایجنٹوں نے ہمارے عام اجلاسوں کو خراب کرنے اور فسادات کرانے کی کوشش کی۔ نگران کا مقابلہ انقلابی انصاف پسندوں نے کیا۔ بحران اب اور بڑھ رہا تھا۔ میں جب عمان پہنچی تو مجھ سے کہا گیا کہ میں جبل التاج سکول میں جا کر پبلک لیکچر دوں۔ جب میں چند کامریڈوں کے ساتھ پہنچی تو معلوم ہوا کہ سامعین کو حسین کی فوجوں نے بھگا دیا ہے بلکہ یہ بھی کہ سامعین پر فضا سے گولیاں بھی برسائی گئیں۔ فرنٹ کے لوکل کمانڈو نے ہمیں وحدت کیمپ میں واپس چلے جانے کو کہا اور ہم بغیر سوال کئے چلے گئے۔

---

(۲)

۱۰ فروری کی شام کو میں حیران رہ گئی۔ میرے منگیتر بسم کی بہن سمیرا بغداد سے وہاں پہنچی تھی کہ خاندان سے رسمی طور پر منگنی اور میرے بہو ہونے کا اعلان کرائے بسم اور میں، فرنٹ کی اجازت سے منگنی کر چکے تھے۔ البتہ منگنی سے پہلے دونوں میں سے کسی ایک کے خاندان سے بھی صلاح مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔

سمیرا کی کوئی فوجی تربیت نہیں تھی اور میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی کہ جہاں میں اُسے محاذِ جنگ سے دور رکھ سکتی۔ مگر اس نے اپنے کھرے عراقی لہجے میں کہا "لیلیٰ! جو تم کہو گی میں وہ کروں گی۔ میں بھی تو ایک عرب خاتون ہوں۔ میں بھی لڑنا چاہتی ہوں۔"

میں نے ہنس کر کہا "چلو یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آؤ جبل عمان چلیں۔ مجھے وہاں کچھ پیغامات دینے ہیں۔ میں نے ایک بندوق اور ہینڈ گرنیڈ لیے اور ٹیکسی لے کر چل دی۔ جیسے ہی ہم پہاڑی پر چڑھے، ہم نے جلتی ہوئی جیپ دیکھی اور بندوقوں کی گولیوں کی آوازیں سنیں۔ فتح کے کچھ ساتھیوں نے ہمیں روکا اور آگے جانے کے خطرے سے آگاہ کیا۔ ڈرائیور نے بھی کہا کہ ٹیکسی چھوڑ دو کہ میں تو مرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ سمیرا کو بہت غصہ آیا اور

اس نے اُسے بزدل اور بے شرم کہا۔ بے چارہ ڈرائیور بولا کہ اس کے آٹھ بچے ہیں وہ کرایہ لیے بغیر ہی واپس لوٹ گیا۔ فتح کے ساتھیوں نے بتایا کہ پورے علاقے میں آگ لگی ہوئی ہے اور لوگوں کو نکالا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور کہا کہ جنگ تو پہلے ہی شروع ہو چکی ہے اور چیخا "لیلیٰ! واپس وحدت کیمپ چلی جاؤ۔" میں نے اُسے ہینڈ گرنیڈ دکھایا اور کہا کہ میں تو لڑنے کے لیے تیار ہوں اس نے پھر چلّا کر کہا "آؤ پھر میرے ساتھ" ہم ملٹری بیورو کو فون کریں کہ شواہد بتا رہے ہیں کہ حسین ہمارے ٹھکانوں پر قاتلانہ حملہ کرنے والا ہے۔ ہم نے جا کر فون کیا۔ پھر میں اور سمیرا وحدت کیمپ آئے اور ساری صورتِ حال بتائی۔ اب ڈاکٹر جبش نے ہمیں پٹرول بم تیار کرنے اور حسین کے سپاہیوں پر استعمال کرنے کو کہا۔ میں نزدیکی پیٹرول پمپ، پٹرول خریدنے کو گئی۔ وہاں موجود لڑکے نے کہا کہ میں جتنا پٹرول چاہوں لے سکتی ہوں اور وہ اس کا ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ ہم نے تقریباً ساری رات پٹرول بم بناتے اور گوریلوں میں تقسیم کرتے گزاری۔ چونکہ فرنٹ کے پاس کوئی ہتھیار سپلائی کرنے والا نہ تھا۔ اس لیے ہمیں اپنے وسائل یا دشمن کے قبضہ کیے ہوئے ہتھیاروں پر ہی انحصار کرنا ہوتا تھا۔

کامریڈ نادیہ کا حال ہی میں بطور سکوئیڈ کمانڈر تقرر ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے پاس مقابلتاً اسلحہ بہت کم ہے۔ پھر بغیر کسی کو اطلاع دیئے اس نے اپنے سکوئیڈ کے ساتھ اردنی پولیس سٹیشنوں پر پانچ حملے کئے اور وہاں سے ۸۰ ہتھیار اور سینکڑوں بارودی گولے، بغیر کسی شخص کو مارے، حاصل کر لیے۔ آدھی رات کے قریب کامریڈ صلفہ اور میں نے جبل عمان جانے کے لیے رضاکارانہ خدمات پیش کیں تاکہ اپنی چوکیوں کو چیک کیا جا سکے اور حسین کی فوجوں کی پیش قدمی کے بارے میں براہِ راست رپورٹ مل سکے۔ ہمارے لیڈر اس شرط پر مانے کہ ہم دونوں سویلین کپڑوں میں جائیں گے

ہم نے جانے سے پہلے اصرار کیا کہ ڈاکٹر جبش کو عمان میں کہیں اور محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر جبش نے خود اعتراض کیا کہ میں محفوظ ہو جاؤں اور لیلیٰ اور صلفہ اُسی مقصد کے لیے مرنے کو جا رہی ہوں۔ ہم یہ اعتراض سن کر چپ چاپ چلے گئے اور رات گئے وحدت کیمپ لوٹے۔

ابھی ہم سوئے ہی تھے کہ حسین کی آرٹلری کی سب مشین گنوں کے دھماکے سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ آٹھ فائٹرز نے اپنی اپنی کمان سنبھال لی۔ میں کامریڈ داؤد کے ساتھ مسجد میں گئی کہ جنگ کی خبریں نشر کی جائیں اور عوام کو انقلاب کے دفاع کے لیے ہمارے ساتھ آنے کی ترغیب دی جائے۔

۱۰ فروری ۱۹۷۰ء کو نومبر ۱۹۶۸ء کے بعد سخت مزاحمانہ لڑائی کا منظر بنا۔ حسین کی فوجوں نے آگے بڑھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ہمارے مورچوں کو نقصان نہ پہنچا سکے اور آخر کو دن بھر کی لڑائی کے بعد انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ مزاحمت کے دوران کئی شدید نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ فرنٹ کو ابو طلعات کا نقصان اٹھانا پڑا، ابو طلعات ہمارے بہادر کمانڈروں میں سے تھا۔ ابو طلعات کی شہادت نے ہمیں کھولا دیا تھا اور ہم سب حشمتی خاندان کی شہنشاہیت کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ ابو طلعات کا جنازہ بڑی شان سے اٹھا۔ ہزاروں لوگوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔ اس جنازے پر رمزیہ شہید عبدالمحسن حسن کی بیوہ نے ایک بھی آنسو بہائے بغیر دلیرانہ تقریر کی:

"ابو طلعات! تم زندہ رہو گے، تمہارے بچے تمہیں زندہ رکھیں گے۔ محسن مجھے نو بچوں کے ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ تم دونوں ہمیں بارہ گوریلے دے کر گئے ہو جو فلسطین کی آزادی کی شمع کو لے کر آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ جن شقی لوگوں کے ہاتھوں تم مرے ہو، ہم ان لوگوں کے ہاتھوں سے اپنی سرزمین کو

آزاد کرائیں گے۔ تم نے فلسطینیوں اور سارے جہان کے مظلوموں کے لیے مثال قائم کی ہے۔ خدا کرے تمہارے جیسے لاکھوں ہو جائیں۔ تم زمین میں جاؤ اور فلسطین کی ابدیت کی خاک میں شامل ہو کر یہی خاک پھر تم جیسے اور شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہو۔

تم زندہ رہو گے کہ انقلاب زندہ رہے گا۔"

حسین کے وحشیانہ رویے اور مزاحمتی کیمپوں کے خلاف تحریک نے حسین کو اپنی فوج کی تطہیر کرنے اور ابتدائی ترتیب نو کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا مجموعی کمان مرتب کی گئی کہ امریکی اسلحہ اور ٹینکوں کی چھاؤں میں حسین نے خون کی ندیاں بہانے کا نیا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ البتہ دوسری طرف فرنٹ نے اپنے کیمپوں اور لائحہ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ حالانکہ بہت سے کامریڈ مارے گئے یا زخمی ہوئے کہ ہماری طرف سے جوابی کارروائی میں اجتماعی کارکردگی کی جھلک نہ تھی۔

ادھر حسین نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا۔ اس تمام عمل کو سول وار ختم کرنے کی جانب احتیاطی اقدامات کا نام دے کر، خاک و خون کی اس ہولی کو ختم کرنے اور عرب اتحاد کا نعرہ دے کر فلسطینیوں کو مذاکرات کی دعوت دی۔ مگر بیک وقت حسین کو اپنے ناکام انجام کا بھی خوف تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ فتح اور عرب عوام کو اب تک عرب برادری پر اعتماد تھا اور اس لیے اس کے ساتھ گزارا کرنے کو تیار تھے۔ وہ مزاحمت کو امریکہ اور اسرائیل سے وقتی طور پر مراعات لینے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا تاکہ وقت پڑنے پر دائمی امن کے مذاکرات میں کچھ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

عمان میں مزاحمتی گروپوں اور امریکی پٹھوؤں کے درمیان وقتاً فوقتاً لڑائی جاری رہی۔ جوزف سسکو، اسسٹنٹ سیکرٹری برائے مشرق وسطیٰ اپریل کے

وسط میں اردن آئے۔ عوام نے یک زبان نعرہ زن ہو کر امریکی "امن" کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ مگر نہ امریکہ نے اور نہ حسین نے اس صدا پر کان دھرے۔ یہ بات اور بھی واضح اس وقت ہوئی جب گلی گلی اور محلے محلے، اردنی فوج کے افسران خود سول وار کے لیے لوگوں کو اکساتے اور فلسطینیوں اور اردنیوں میں جنگ کے شعلے بھڑکاتے پھرے، پاپولر فرنٹ نے اس مہم کو خطرناک حد تک پہنچنے سے پہلے ختم کرنے کے لیے عمان میں فوجی اہمیت کی چوکیوں پر قبضہ کیا اور امریکی سفارتخانے کے فرسٹ سیکرٹری کو یرغمال بنا کر اس سازش کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ مزاحمتی گروپ کی جانب دباؤ کی بنا پر ہم نے اُسے رہا کر دیا۔ مگر انقلاب دشمن تشدد کم ہونے کی بجائے بڑھا ہی اور مزاحمتی گروپ کو یہ توقع نہ تھی۔

پاپولر فرنٹ نے اب فلیڈلفیا اور انٹرکانٹیننٹل ہوٹلوں پر قبضہ کر کے سارے غیر ملکی مہمانوں کو یرغمال بنا لیا۔ حسین اسی بہانے کی آڑ میں کہ اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ اپنے دشمنوں پر آگ کے گولے برسا رہا تھا۔ اس لڑائی میں کوئی ایک ہزار آدمی مارے گئے۔ قتلِ عام کو امریکی لغت میں سازشیوں سے پاک کرنے کا نام دیا جاتا ہے اور سارا الزام جنرل زید بن شاکر پر رکھ دیا گیا کہ چونکہ گوریلوں نے اس کی بہن کو مارا تھا۔ اس لیے اس نے جواباً سارے اقدامات کیے تھے اس لیے جنرل زید اور حسین کے چچا شریف ناصر استعفیٰ دے گئے اور حسین نے مسلح افواج کی کمان بھی سنبھال لی۔

۴۳

جون کے واقعات سے ظاہر ہوا کہ فتح نے ابھی سبق نہیں سیکھا تھا۔ بھرپور عوامی قوت اور اعتماد ہونے کے باوجود، ہم حسین کو شکست نہ دے سکے تھے۔ جون اور ستمبر کے درمیان حسین نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور جو لوگ بھی فلسطینیوں سے ہمدردیاں رکھتے تھے۔ ان کو نکال دیا گیا۔ ادھر پاپولر فرنٹ نے ایسے لوگوں کو تسلیم کرنے کی مہم شروع کی۔ اب یہی عرب سماجی انقلاب کا نمائندہ دکھائی دے رہا تھا عرب رجعت پسند اور ترقی پسند، فتح کے لوگوں کو "ایماندارانہ انقلابی" اور پاپولر فرنٹ کو "دہشت پسند انقلاب درآمدہ نظریات" پر مبنی کہنے لگے۔ حسین نے اعلان کیا کہ نہتے مہاجرین پر بمباری، فرنٹ کے لوگوں کے برتاؤ کی بنا پر ہوئی ہے اور اس میں حسین کی حکومت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لوگوں نے اس اعلان پہ اعتماد نہیں کیا کہ عوام آزادی چاہتے تھے اور فرنٹ کو اس جدوجہد کا اہل سمجھتے تھے۔

موسم بہار ۱۹۷۰ء میں دوست اور دشمن کے درمیان امتیاز کی لکیر اور گہری ہو گئی۔ عوام کو یقین تھا کہ حسین اور عرب رجعت پسند، دشمن کے کیمپ میں تھے لوگوں کو یہ بھی یقین تھا کہ عرب ترقی پسند ہی آزادی اور قومی بین عرب تحریک

کے لیے آگے بڑھیں گے اور یہی لوگ صیہونیت، سامراجیت اور عرب رجعت پسندوں کے خلاف سینہ سپر ہوں گے۔ اس بدقسمت موسم بہار میں" ترقی پسندوں نے ماسکو کے کہنے پر واشنگٹن اور تل ابیب کے ساتھ امن کا اشارہ دیا۔ مگر ستمبر ۷۰ء تک اس اشارہ کی اصلیت اور مزاحمت کو روکنے کی سازش بے نقاب ہو گئی جولائی ۷۱ء میں یہ بات اور کھل کر سامنے آگئی کہ سادات نے ناصرازم کو کھود کر نکالا اور پاپولر فرنٹ کے خلاف محاذ آرائی کے لیے قاہرہ یونیورسٹی کو استعمال کیا گیا۔

ناصر نے یوم مئی ۷۰ء کی تقریر میں کہا تھا کہ عرب امریکن تعلقات کی استواری کے امکانات بالکل معدوم ہیں۔ امریکہ کو گالی دینے کی بجائے اس نے کہا کہ امریکہ کا رویہ اسرائیل نواز زیادہ ہے اور پھر ناصر نے امریکہ کو دسمبر ۶۸ء کے مذاکرات کے مطابق عرب دنیا سے تعلقات خوشگوار کرنے کی دعوت دی گویا عرب اسرائیل تنازعے میں صیہونیت نواز امریکہ ہی کو دعوت کہ وہ مسائل حل کرے۔ اس کے جواب میں راجرز نے گزشتہ "امن مسودے کا حوالہ دیتے ہوئے بال پھر ناصر کی کورٹ میں پھینک دی۔

اب پھر ۲۳ جولائی سے ناصر کا تاریخی بم شیل آیا۔ اس دن انقلاب مصر کی اٹھارویں سالگرہ تھی۔ ناصر نے راجرز کی" امن تجاویز" کو اس حد تک قبول کیا کہ جنگ بندی اور اسلحہ میں تخفیف کے علاوہ مذاکرات سے اسرائیلیوں کو مقبوضہ علاقوں سے نہ نکلنے کی شرط بھی مان لی۔

ناصر کی اس "دانشمندانہ ڈپلومیٹک پالیسی" کو ان کے اپنے بہت ہی معتبر صحافی محمد حسنین ہیکل نے، عرب انقلابیوں کے لیے دھچکہ قرار دیا صیہونی معاشرے کا نفاذ، جسے ناصر نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اب کھل کے سامنے آگیا۔ گہال، دائیں بازو کی پارٹی نے قومی مخلوط حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی جبکہ اسرائیل نے فائر بندی

منظور کرلی۔ عرب ریاستوں نے سوائے عراق اور الجزائر کے، باقی سب نے ناصر کی" امن برآری" کی کوششوں کی زبانی تائید کی۔ صحافیوں نے ناصر کے برملا اعلان کی تعریف کی فلسطینی جو ناصر کے دیوانے تھے۔ وہ عمان، مقبوضہ یروشلم اور مغربی کنارے کے بڑے شہروں میں یہ چیختے چلاتے پھر رہے تھے۔" ناصر بزدل ہے۔" "ناصر غدار ہے"۔ ناصر کا حریت پسندبت پاش پاش ہو چکا تھا اور پھر جب اس نے مصری یونیورسٹیوں سے فلسطینی طلباء کو خارج، فتح کا براڈکاسٹنگ سٹیشن بند، اور اپنے ساتھیوں کو برملا پاپولر فرنٹ کے دفاتر اور افراد کو تباہ کرنے کو کہا تو ناصر تو امریکی حاشیہ بردار قرار دیا جانے لگا۔ اس کے قریبی مداحین بھی اشتباہ کا شکار ہو گئے۔ اب معلوم ہوا کہ ہماری امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے امریکہ، روس، عرب اور صیہونی سب اکٹھے تھے۔

۲۳ جولائی کی تقریر میں صدر ناصر نے کہا تھا" ہم اپنی سرزمین کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ ہم فلسطینیوں کے حقوق چاہتے ہیں۔ ہم نے امریکی تجاویز قبول کی ہیں۔ ان میں ہر چند کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے انہیں ماضی میں بھی تسلیم کیا تھا۔ اسرائیل ہم پر ایک ہزار ٹن کے بم پھینکتا ہے۔ البتہ جب مصر میں جدید روسی اسلحہ آیا تو ہم پر بھرپور حملہ کیا گیا۔ مگر امریکی اخبار نے یہ اشارہ بھی نہیں کیا کہ اسرائیل کے پاس دفاع کے لیے ۷۲ میزائل ہیں۔ اس کا کیا مطلب؟ کیا اس کا مطلب ہے کہ اپنے دفاع کا کوئی حق نہیں جبکہ اسرائیل کو ہے۔"

ناصر کے بیان میں دو تضادات تھے۔ ایک تو مصر کے دفاع کا حق اور دوسرے فلسطینیوں کا اپنی آزادی کے لیے لڑنے کا حق۔ بہر حال ناصر کی تجاویز ماننا عربوں کے حوصلے پست کرنے کو کافی تھا۔ اس اعلان کے دو ہفتے تک بھی سیز فائر قائم نہ رہا۔ مزاحمت تو تھی اور اس وقت تک رہنی تھی جب تک ان کے خیال میں ہاتھ

میں ہاتھ ڈال کر صیہونیت اور عربیت سلمان کے مقبرے اور عمر کی مسجد تک نہ چلتے البتہ یہ ہوا کہ مزاحمت کو کم کرنے کی مشترکہ کوششیں شروع ہو گئیں۔ فتح کے لیے فنڈز بند کر دیئے گئے۔ عالمی سطح پر مزاحمت کے خلاف جنگ شروع کی گئی۔ فائدہ حسین نے بھی اٹھایا اور بغیر تخصیص کے اٹھایا۔ انقلابیوں کا صفایا شروع کر دیا کہ اس حملے میں سارے انقلابیوں کے صفائے کی توقع کی گئی تھی۔

پاپولر فرنٹ نے ہر دوست اور دشمن کو اپنی اصلیت دکھانے کا موقع دیا کچھ عرب رہنماؤں نے حسین کی پالیسیوں سے اختلاف کیا۔ دوسروں نے ان سے ہاتھ ملائے یا ان کے کہے پر تالی بجائی۔ بہت سے قانونی اقدامات اور امنِ عامہ کو یاد کرتے رہے۔ اب فرنٹ نے جارحانہ سرگرمیوں کا فیصلہ کیا۔

میرے کامریڈ اور میں یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے کہ بین الاقوامی سطح پر بڑی طاقتوں، صیہونیت اور ان عرب ریاستوں کے خلاف کھلم کھلا جارحیت اور پراپیگنڈہ شروع کیا جائے کہ کس طرح تیسری دنیا، عرب مظلوموں اور فلسطینیوں کو محکوم رکھنے کے لیے یہ ساری قوتیں متحد ہیں۔ ہم اس لیے بھی نکلے تھے کہ اگر ہم نے اعلان نہ کیا اور ہمیں ناکام متصور کر لیا گیا تو امریکہ انقلاب کی شکل ہی بدل کر رکھ دے گا کہ جو ویت نام کے انقلاب کے بعد روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمارا کم از کم مدعا یہ تھا کہ انسانیت کے ذہن پر فلسطین کا ایک باعزت باوقار اور آزادی پسند قوم کے نام کے طور پر تازہ رہے۔ ہمارا مدعا عرب تضادات اور فاسسٹ قوتوں کو بے نقاب کر کے مظلوموں کے تک پہنچانا بھی تھا۔

"ہم گمشدہ انسانیت کے ترجمان ہیں"

پاپولر فرنٹ ، اپنے بے پناہ اداروں میں ، دراصل عالم عرب کی عکس نما ہے اور ہم اسے بنانا بھی اسی طرح چاہتے ہیں ۔ اس لئے ہر ممبر کو عمومی مفادات کے کام آنا اور فرنٹ کی ہر ممکن مدد کرنا آنا چاہیئے ۔ تب ہی فرنٹ عرب عوام کی آزادی اور صیہونی دشمنوں کو نابود کرنے کا فرض انجام دے سکے گی ۔

(ا)

ایک سپاہی کی حیثیت میرا انتخاب، غیر ملکی آپریشن کے لیے ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ۱۹۶۹ء میں شامی حکومت نے میری شناخت ظاہر کر دی تھی جبکہ میں اور سلیم عیساوی نے ٹی۔ ڈبلیو۔ اے ۔ ۸۴۰ جہاز اغوا کر کے دمشق میں اتارا تھا۔ اگر شامی یہ شرارت نہ کرتے تو میں بھی فرنٹ کے سینکڑوں کارکنوں کی طرح بے نام رہتی۔ صیہونی ہسٹریا نے مجھے ساری دنیا میں اتنا مشہور کیا کہ روز کہیں نہ کہیں میری تصویر اور میرے بارے میں چھپتا رہتا۔ مگر اس طرح میرا بطور انقلابی کردار ختم نہیں ہوا۔ کچھ لوگ سمجھتے کہ میں اربد میں کام کر رہی ہوں۔ میرے گھر کے لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں ابھی مصر میں ہوں میں دراصل ابھی ال اے جہاز کے کمانڈروں کو تربیت دے رہی تھی۔ تربیت کی تفاصیل بہرحال راز ہیں۔ اس لیے ان پر بات نہیں کروں گی۔ پہلی ہی کوشش یعنی جہاز کے اغوا سے، فرنٹ میں میری پوزیشن مستحکم اور میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں کہ بڑا افسر بننے کا مطلب، فرنٹ میں سہولتوں کا اضافہ نہیں بلکہ ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

مارچ ۱۹۷۰ء میں مجھے عمان میں ایک غیر معلوم مقام کی سمت جانے کا حکم ملا۔ یہاں میرے تین پلاسٹک سرجری آپریشن ہوئے تاکہ میں مطلوبہ ملٹری آپریشنز

سرانجام دے سکوں۔ یہاں پہلے تو ایسا ڈاکٹر حاصل کرنا اور پھر انقلابی تحریک کے لیے اس کا کام کرنا ناممکن معلوم دے رہا تھا۔ آخر کو ایک ڈاکٹر دستیاب ہوا جو خود بھی سرجری کرنی چاہتا تھا۔ مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہونے والا شوہر اپنی بیوی کا چہرہ مسخ کیا ہوا، کیوں دیکھنا چاہتا ہے: وہ بہت اُلّو ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ ہاں ہاں، "ڈاکٹر" پر خدا کے لیے آپریشن جلدی کیجئے۔

۱۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو میرا چہرہ بدلنے کو پہلا آپریشن ہوا۔ میں نے بے ہوشی کی دوائی لینے سے انکار تو کر دیا تھا۔ مگر مجھے تکلیف بہت ہوئی کہ مجھے سوئیوں کی آمد و رفت بھی نظر آ رہی تھی اور مجھے اپنا چہرہ چھدتا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب کے لوگ سمجھیں گے میں اذیت پرست تھی، مگر نہیں۔ میرے سامنے قوم کا بڑا مقصد تھا۔ میرا آپریشن میرے ان بہن بھائیوں کو تکلیف سے چھڑانے کے لیے تھا جو غلامی کی اذیت میں مبتلا تھے۔

آپریشن کے ۲۰ دن بعد تک مجھے صرف رقیق اشیاء کھانی تھیں۔ آپریشن تھا بھی ایک راز۔ ایک درجن سے کم افراد کو اس کا پتہ تھا۔ مجھے ہسپتال میں رکھا گیا اور کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ میں اپنے کمرے سے مٹرنٹی وارڈ کی طرف جانے اور آنے والوں کو دیکھتی۔ بس یہی میری مصروفیت تھی۔ سب سے مشکل بات یہ تھی کہ میری نرس کو عربی آتی تھی نہ انگریزی۔ وہ آرمینین تھی۔ یہ مرحلہ بھی میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہسپتال میں کوئی بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ ایک دن جب نرس کو مدد کے لیے بلا رہی تھی، ایک شخص جو اپنی بیوی کو ہسپتال میں دیکھنے آیا تھا، وہ میری مدد کو اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی نہ صرف مجھے پہچانا، بلکہ میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے فوراً انکار کیا کہ میں تو لیلیٰ ہوں ہی نہیں۔ مجھے اعتبار ہی نہیں آیا۔ جب میں ہسپتال سے نکلنے لگی تو میں نے اس کی نومولود

بیٹی کو ایک نکلس دیا جو گولیوں کا بنا ہوا تھا اور اس کے لیے ایک اچھے انقلابی مستقبل کی دعا کی۔

مقررہ وقت قریب آ رہا تھا اور ابھی میرے "میک اَپ" کا کچھ حصہ باقی تھا دو اور اپریشن کئے گئے۔ آخری تو مقررہ جہاز کے اغواء سے صرف چند روز پہلے کیا گیا۔ میرے بہت سے کامریڈ یورپ میں میرے منتظر تھے۔ ایکدم حکم آیا کہ سب کچھ ملتوی کر دیا جائے کہ فی الوقت اردن سے مخاصمت نہیں کرنی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی مگر میں بددل نہیں ہوئی۔

---

(۲)

اسرائیل اور ان کے حواری، ہوشیار دشمن تھے۔ میں ہسپتال سے فارغ ہوئی یہ ۱۱ جولائی ۷۰ء کی بات ہے۔ وقت تھا سوا دو بجے رات اور میں ڈاکٹر ودی حدّاد کے کمرے میں بیٹھی تھی اور ہم لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔ اس کی بیوی اور بچہ دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ نامعلوم کہاں سے ایک راکٹ کھڑکی سے آکر ٹکرایا۔ ہم میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ ہم نے اپنی بندوقیں نکال لیں۔ پھر شعلوں کے درمیان اس کا خاندان خون میں نہائے، روتا بلبلاتا باہر آیا۔ بجلی بھی بند ہوگئیں۔ ہم ذرا گھبرا گئے کہ آگ، اندھیرے میں کچھائی پڑ رہی تھی۔ میں نے آٹھ سالہ ھانی کو گود میں اٹھایا اور اوپر چیختی ہوئی چڑھی "آگ آگ" ..... ھانی کے سینے سے خون نکل رہا تھا اور اس کے پیر تو بالکل کچلے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایک ہمسائی نے پناہ دی اور فائر بریگیڈ کو فون کیا۔ میں پریشان تھی مگر ھانی بالکل خاموش اور پرسکون تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے کہا "لیلیٰ! فرنٹ کے انقلابیوں کو تو خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے" میں اس بچے کی انقلابی باتیں سن کر شرمندہ ہوئی۔ میں نے اسے پیار کیا اور اسے باہر لائی۔ ہسپتال لے جانے کے لیے میں نے ایک ٹیکسی

رد کی، جس نے ہمیں لے جانے سے انکار کر دیا اور میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ایکدم فرنٹ کا ایک ممبر ابو داؤد آ گیا اور ہم امریکن یونیورسٹی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بہتے خون اور حانی کو اٹھائے بھاگتی جاتی اور آواز لگاتی جاتی کہ کوئی ڈاکٹر ہے . . . . اتنے میں ایک ڈاکٹر آیا اور بچے کو دیکھے بغیر اس نے کہا کہ علاج کے لیے میرے پاس پیسے ہیں۔ میں نے چیخ کر کہا "کیا تم ڈاکٹر ہو کہ قالین کے تاجر؟" اس نے بڑے سکون سے کہا کہ امریکن ہسپتال ہسپتال ہے کوئی خیراتی ادارہ نہیں"۔ میں نے کہا "چونکہ آپ تجارت کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو ہدیہ ملے گا۔ مگر بچے کو حفاظت سے رکھنا"۔ اتنے میں ڈاکٹر حدّاد اور ان کی بیوی بھی بچے کو تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ ماں تو بالکل ہذیانی کیفیت میں مبتلا تھی۔ امریکی ڈاکٹر نے ڈاکٹر حدّاد کو پہچان لیا کہ وہ ساتھی ڈاکٹر تھے۔ اب تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور معافی مانگی۔ مجھ پر اس کی شرمندگی کا ذرا اثر نہ ہوا میں نے چیخ کر کہا "اے امریکی ڈاکٹر! انقلاب امریکی ہسپتال کو غریبوں کا ہسپتال بنا دے گا اور تم جیسے ڈاکٹر واپس امریکہ بھیج دیئے جاؤ گے"۔ امریکی ڈاکٹر کا چہرہ میری باتیں سن کر بالکل ہی اتر گیا اور اس نے پھر معذرت کی۔

ڈاکٹر حدّاد کے اپارٹمنٹ پر حملے سے ہم میں اور جوش پیدا ہوا۔ اور اب ہم نصب العین کے لیے بالکل مرنے مارنے کو تیار ہو گئے تھے۔ میں جب اگست میں فرینکفرٹ گئی تب بھی میرے ذہن میں ڈاکٹر حدّاد کے جلتے ہوئے اپارٹمنٹ کا نقشہ تازہ تھا۔ فرینکفرٹ میں جس ہوٹل میں ٹھہری اس کا مالک یہودی تھا اور وہ اوسط درجے کا ہوٹل تھا۔ اس نے میرا استقبال عربی بول کر کیا۔ میں نے جواب دینے سے احتراز کیا اور غیر عرب بن کر اپنا آپ ظاہر کیا۔ اس نے پھر بھی مجھ سے عربی میں بات کرنے پر زور دیا اور جوشِ خطابت میں مجھ سے کہنے لگا:

تمہیں معلوم ہے کہ میں یہودی ہوں"۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ "میں ایک عرب خاتون ہوں۔ میں یہودیوں کے خلاف نہیں ہوں۔ میں صیہونیت کے خلاف ہوں اور ان لوگوں کے خلاف ہوں جنہوں نے عرب علاقے پر قبضہ کیا ہوا ہے"۔ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "میں مذہب کے حوالے سے صیہونی ہوں مگر مجھے سیاست سے کوئی لگاؤ یا دلچسپی نہیں ہے۔" اب ہماری لڑائی ختم ہو گئی تھی۔ میں اوپر کمرے میں گئی اور اگلے دن صبح تک وہاں رہی۔ آخر جب میں تھک گئی اور بہت بھوک محسوس ہوئی تو میں باہر سیر کے لیے نکل آئی۔ میرا یہودی دوست ڈیسک پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر میرا حال پوچھا اور کہا کہ کیا میں ایمسٹرڈم جانا چاہوں گی کہ وہ اپنے دوستوں کے لیے ایک پروگرام بنا رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر انکار کیا اور کھانے کی تلاش میں نکل گئی۔ راستے میں میں نے انگریزی کے کئی اخبار خریدے۔ سب میں اردن سے متعلق خبریں بھری پڑی تھیں اور کچھ میں اداراتی نوٹ تھے کہ جن میں راجرز منصوبے کے روبہ عمل ہونے پر عرب اسرائیل اور بڑی طاقتوں کے تعلقات کے بارے میں اظہارِ رائے کیا گیا تھا۔ ہر اخبار میں کسی نہ کسی انداز میں مستقبل میں ہونے والے جہاز کے اغوا کے خدشے کا اظہار کیا گیا تھا۔ پہلے میں مضطرب ہوئی، مگر یہ دیکھ کر مطمئن کہ اغوا کا علاقہ ایمسٹرڈم نہیں زیورچ بتایا گیا ہے۔

مجھے اپنے مشن کا خیال ستا رہا تھا۔ میں ہر روز صبح اس کی ریہرسل کرتی۔ میں کچھ دن فرینکفرٹ میں گھومی، انتظار کر کر کے بہت بور ہوئی۔ پھر میں کچھ عرصے کے لیے ایمسٹرڈم اور سٹٹ گارڈ گئی۔ تاریخ کے ساتھ معرکے کے دن قریب آ رہے تھے۔ پیٹرک آرگیلو نے اسے اپنے خون سے لکھا۔ میں اس قدر خوش نصیب نہ نکلی۔ میں پیٹرک آرگیلو سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں ملی تھی۔ سٹٹ گارڈ، ایئر ٹرمینل

کے سامنے ہم ایک دوسرے کو پیغام دیئے اور صورتِ حال کا مختصراً جائزہ لیا۔
اگلے دن ہم دونوں فرینکفرٹ گئے۔ ائیرپورٹ پر مسٹر ریاض (پیٹرک) کی تلاشی لی
گئی اور میں یہ دیکھ رہی تھی کہ ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کی تل ابیب اپیل جانے والی فلائیٹ
کے مسافروں کی بہت تلاشی لی جا رہی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں دشمن کو کافی
تکلیف دے رہی ہوں میں نے جی ہی جی میں کہا۔ یہی تو جہاز ہے جسے تل ابیب
سے واپسی پر ہم نے اغوا کرنا ہے۔ پیٹرک کی کسٹم میں کلیرنس بغیر کسی شک و شبہے
کے ہو گئی۔

(۳)

اب اگلا سٹاپ ایمسٹرڈم میں تھا۔ ۶ ستمبر کو پیٹرک اور میں صبح دس بجے ایل
اے۔ ون کاؤنٹر پہ ملے۔ ہم نے کوئی آدھا گھنٹہ دفتر کے کھلنے کا انتظار کیا۔ وہ دفتر
اُس دن کھلا ہی نہیں۔ ہم فلائیٹ شیڈول چیک کیا۔ بورڈ پر لکھا تھا کہ ایل۔ اے۔
ون فلائیٹ ۲۱۹ نیویارک کے لیے ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ، قبل دوپہر جا رہی ہے
ہم نے کے۔ ایل۔ ایم کی گراؤنڈ ہوسٹس کو مدد کرنے کے لیے کہا۔ اس نے ہمارے
ٹکٹ لے کر ایل۔ اے۔ ون کے دفتر فون کیا۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں تھا۔
کے۔ ایل۔ ایم کی ہوسٹس بھی پریشان ہو گئی۔ پھر اس نے کہا کہ آپ ایل اے ون
فلائیٹ ہی کیوں لینا چاہتے ہیں۔ دوسری فلائیٹ لے لیں جو اس سے بہتر اور آرام دہ
بھی ہیں۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم ایل۔ اے۔ ون ہی میں سفر کر سکتے ہیں۔ ہم
انتظار کر رہے تھے کہ پین۔ ایم فلائیٹ ۸۴۰ آئی اور مجھے ٹی۔ ڈبلیو۔ اے
فلائیٹ ۸۴۰ یاد آ گئی۔ مجھے اس وقت تک نہیں معلوم تھا کہ ہمارے دو کامریڈ
کہ جنہیں ایک پہلی کوشش میں اسرائیلیوں نے پکڑ لیا تھا فی الوقت پین۔ ایم کی
فلائیٹ ۸۴۰ کو پرواز کے آدھے گھنٹے بعد ہی اپنے طور پر قابو پانے کی فکر میں
تھے وہ ۷۴۷ میں قاہرہ گئے اور جہاز کو فلسطین آزادی کے اعلانیے کے طور پر

اُڑادیا۔ نہ پٹرک کو اور نہ دوسرے پانچ مرد ہائی جیکروں کو معلوم تھا کہ اس دن تین جہاز ہمارے نشانوں کی زد میں تھے۔ صرف تین خاتون کپتان اور چند دوسرے افراد کو سارے منصوبے کا علم تھا۔ ہم اپنے جہاز کا انتظار ۱۲ بج کر ۵ منٹ تک کرتے رہے۔ مگر دور دور تک ایل۔ اے وی کا کاؤنٹر نشان کا پتہ نہ تھا۔

ایکدم ایک پولیس افسر اسرائیلی یونیفارم میں ظاہر ہوا۔ "آپ لیٹ کیوں ہیں؟" اس نے پوچھا۔ میں نے صبر سے جواب دیا۔ "ہم تو یہاں دس بجے سے موجود ہیں۔" اس نے کہا کہ میں کے۔ ایل۔ ایم کی ہوسٹس کو کہہ کر آپ کا انتظام کراتا ہوں۔ پھر اس نے پاسپورٹ اور کاغذات مانگے۔ اس نے ایک ایک صفحہ غور سے دیکھا۔ میری تصویر دیکھ کر اس نے بار بار میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ہمارے آگے پیچھے ہوتا رہا۔ اس نے مجھے ہینڈ بیگ خالی کرنے کو کہا اور ہر چیز کو چھو کر دیکھا۔ پٹرک نے بزنس سوٹ پہن رکھا تھا اور میں نے منی سکرٹ اور جیکٹ۔ میں نے خود کو ہنڈراس کی ماریا سنگیزہی بنائے رکھا۔ بار بار روزمرہ کے سوالات کئے گئے۔ ایک دم میں نے اونچی اونچی آوازیں سنیں۔ میں نے دیکھا کہ تین عرب میری جانب چلے آرہے ہیں۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ اگر اس نے مجھے پہچان کر سلام کیا تو، میرا سارا بھرم کھل جائے گا۔ خوش قسمتی سے اسرائیلی افسر کی ان کی طرف پیٹھ تھی۔ چونکہ ہم اس کے کہنے پر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔ میں نے فوراً اپنے بازو پٹرک گرد لپیٹ لیے۔ پٹرک حیران ہوا۔ ابھی وہ یہ طے نہ کر پایا تھا کہ ایسی پاگل عورت کے عمل پر ردّ عمل کیا کرے کہ اتنی دیر میں ہمارے عرب دوست ایل۔ اے۔ وی کے افسروں یا کسی اور کی نگاہوں میں آئے بغیر گزر گئے تھے۔ افسر کو ہم سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ اس نے بڑی نرمی سے ہمیں اپنے ساتھ چلنے اور نیچے جا کر سامان چیک کرانے کو کہا۔

"آفیسر! ہمارا سامان کھلا ہے۔ آپ خود جا کر چیک کر کے اطمینان کر سکتے ہیں"۔ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "میڈم! قانون یہ ہے کہ سامان مالک کی موجودگی میں چیک کیا جائے۔" آفیسر نے کہا۔ ہم ساتھ گئے۔ اس نے سامان چیک کیا۔ ایک دفعہ نہیں دو مرتبہ اور اس دوران وہ بظاہر بے تکلفی کے سوالات کرتا رہا۔ مگر بڑے تہہ دار اور معنی خیز سوالات تھے۔

پھر وہ خاص مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "کیا آپ کو کسی نے تحفہ دیا ہے"۔ میں نے زور سے کہا "نہیں"۔ اس نے پھر پوچھا "کیا آپ کے پاس کوئی تیز دھار یا خطرناک چیز ہے۔ مثال کے طور پر پستول، چاقو یا کچھ اور؟"

"نہیں جناب! بھلا ایک لڑکی کو ان چیزوں سے کیا واسطہ؟" اس جواب پر وہ مسکرایا اور بولا "آپ لوگ مسافروں کی انتظار گاہ میں جا سکتے ہیں"۔ پھر پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ کو ہسپانوی زبان آتی ہے؟" "نہیں" میں نے جھٹ سے کہا۔ "اچھا خدا حافظ" اسنے کہا۔

پٹرک ذرا حیران سا ہوا۔ پوچھنے لگا۔ "آخر اس نے تم سے ہسپانوی زبان بولنے کو کیوں کہا؟" "دیکھو پٹرک! اگر اُسے خود ہسپانوی زبان آتی تو وہ شروع ہی سے ہسپانوی بولتا۔ جانے دو شکر ہے ہم ایک مصیبت سے نکلے تو!"

ہم جیسے ہی مسافر خانے میں آئے، ہم نے دیکھا تیس چالیس نوجوان موجود ہیں کہ جو ایل۔ اے۔ وی فلائیٹ ۲۱۹ سے جا رہے تھے۔ مجھے پھر یہ صدمہ ہوا کہ مجھے اب پھر نوجوان بچوں کو خوفزدہ کرنا ہوگا۔ ہر چند میں ان معصوم دلوں کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتی ہوں۔ اب مجھے فلسطینیوں کے بچے کہ جن پر اسرائیلیوں نے نیپام بم پھینکے یاد آنے لگے۔ ڈاکٹر حدّاد کا بچہ، آگ سے بھرے کمرے سے بھاگتا دکھائی دیا۔ یہ سارے خیالات مجھے مضطرب کر رہے تھے، حالانکہ میں کوشش یہ

کرتی ہوں کہ مسافروں کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے۔ میں چند لمحوں کے لیے تو بالکل ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی۔ اس دوران پیٹرک ہال میں گھوم رہا تھا کہ ہمارے دوسرے دو کامریڈوں کی نشاندہی ہو سکے۔ جب میں بچوں کی سمت دیکھ رہی تھی، ایک خوبصورت معصوم بچی میری جانب آئی۔ اس کی آنکھیں اس سینڈوچ پر تھیں جو میرے ہاتھ میں تھی۔ جب میں نے بچی کی طرف سینڈوچ بڑھاتے ہوئے کہا "آؤ اور یہ لو"۔ اسی وقت اُس کی ماں نے کہا "آؤ میری بچی اِدھر آؤ" وہ بھی عربی بول رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ میں نے پیٹرک کی طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہا۔ تو پیٹرک سمجھا کہ میں نے کامریڈوں کو پہچان لیا ہے وہ میرے قریب آیا تو میں نے کہا "وہ خاتون اسرائیلی ہے۔ فرض کرو اگر وہ بھی جہاز کو اغوا کرنے کو آئی ہو، تو پھر کیا ہوگا۔ وہ جہاز ایک سمت میں لے جانے کی کوشش کرے گی اور ہم دوسری، کون جیتے گا؟ پیٹرک یہ سن کر بہت ہنسا اور بولا "خیر جیتیں گے تو ہمیں"۔

ہم انتظار کر رہے تھے۔ منٹ بھی گھنٹوں کی طرح گزر رہے۔ کوئی بھی اسرائیلی جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف کے۔ ایل۔ ایم کے جہاز وہاں کھڑے تھے اور ہمیں ان سے کوئی غرض نہ تھی۔ جمبو جیٹ ساڑھے گیارہ بجے جا چکا تھا اب تو بارہ بج چکے تھے۔ وہ اسرائیلی افسر پھر نمودار ہوا اور پھر وہی معائنے کی ترتیب و تفصیل شروع ہوئی۔ ہمیں کمرے کے دوسری طرف جانے کا حکم ملا۔ میں نے کوشش کی کہ میرا غصہ کسی طرح بھی ظاہر نہ ہو۔ پھر تیسری دفعہ معائنہ ہوا اور ہمیں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ اب ڈیڑھ بج گیا تھا۔ جبکہ جہاز کے اغوا کا سب جگہوں سے بارہ بج کر بیس منٹ پر بیک وقت اعلان ہونا تھا۔ اب میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو ہمارے منصوبے کا اسرائیلیوں کو علم ہو گیا ہے۔

اس لیے وہ ہمیں کے۔ ایل۔ ایم کے جہازوں کی سمت دھکیل رہے ہیں۔ یا پھر انہوں نے ہمارے ایک دو کمانڈو پکڑ لیے ہیں اور اب ہمیں پکڑنے کو مضطرب تھے۔ میرے پاس دو ہینڈ گرنیڈ تھے۔ پیٹرک کے پاس ایک ہینڈ گرنیڈ اور ایک پستول تھی۔ میں نے پیٹرک سے کہا "اگر انہیں پتہ بھی چل جائے تو ہتھیار نہیں پھینکنے بلکہ سیمسن کی طرح لڑنا ہے"۔ پیٹرک نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

اب ہمیں نیچے جانے کا حکم ملا۔ وہی افسر کھڑا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات چیک کر رہا تھا۔ میں نے کہا "آفیسر! ہم لیٹ ہو چکے ہیں"۔ "کوئی بات نہیں میڈم! ہم بھی آپ کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر رہے ہیں"۔

ہم جہاز کی سمت بھاری مسلح فوج کی نگرانی میں روانہ ہوئے۔ میں خوش تھی کہ ہماری مزاحمت کے باعث، صیہونی اس قدر پریشان ہو گئے ہیں۔ یوں لگا جیسے دشمن کو ہم دونوں نے پہلے ہی تسخیر کر لیا ہو اور آدھا مشن مکمل کر لیا ہو کہ ان کی تمام حفاظتی تدابیر بیکار ثابت ہوں گی۔ میں جہاز میں چڑھی تو بارہ فوجی مشین گنوں سے مسلح موجود تھے۔ جب میں ایل۔ اے۔ ون کے جہاز میں چڑھی تو مجھے لگا کہ ۱۳ اپریل ۴۸ء کے بعد میں ایک مرتبہ پھر اپنے گھر حیفا میں تھی۔ میرا دل اب شیر تھا۔ میں نے آج سے پہلے کبھی پاپولر فرنٹ کا ممبر ہونے پر اتنا فخر نہیں کیا تھا۔ پیٹرک اور میں نے دو خالی سیٹوں کا انتخاب کیا۔ ہم نے سارے جہاز میں دو دفعہ چکر لگایا۔ پھر جا کر ہمیں ٹورسٹ کلاس میں دوسری قطار میں دو سیٹیں خالی ملیں۔ جب ایئر ہوسٹس نے آ کر پوچھا کہ ہم ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تو یہ فقرہ ہمیں سکون کی فضا معلوم ہوا۔ میں بہت خوش تھی اور اپنے آدھے باقی مشن کو پورا کرنے کے لیے بیتاب۔ جبکہ پیٹرک ذرا بے چین تھا کہ پہلے ہی ڈیڑھ بج چکا پیٹرک مجھے شادیہ کے نام سے جانتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسے اپنی اصلیت

بتا دوں تو اس کے حوصلے اور بلند ہو جائیں گے۔ میں نے اُسے بتایا تو واقعی وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے فاتح کا سیلوٹ دیا۔ میرے ساتھ بیٹھی خاتون فوراً سو گئی تھی۔ سارے مسافر تھکے ہوئے معلوم دے رہے تھے۔ کوئی ایک بج کر پچپن منٹ پر ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں جہاز کے پیچھے سے کوئی مسلسل تاک رہا ہے میں نے پیٹرک سے خاموش بیٹھے رہنے کو کہا۔ میں نے مُڑ کر اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ سویلین کپڑوں میں تھا۔ جب اس نے دیکھا میں اُسے گھور رہی ہوں۔ وہ جھینپ کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔ اس عرصے میں پیٹرک نے ہینڈ گرنیڈ اور پستول تیار کر لی اور میں نے اپنے دونوں ہینڈ گرنیڈز میں سے پنیں نکال لی تھیں۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس سے ہوتے ہوئے کاک پٹ کی جانب بھاگے۔ ایک آدھ مسافر نے ہلنے کی کوشش کی تو ہم چلّائے "اپنی جگہ سے مت ہلو" ہمارے سامنے تین سٹیورڈ دستی بندوقیں لیے کھڑے تھے میں نے ایک سیکنڈ میں گنیں لیں۔ یہ چھ دستی بندوقیں تھیں۔ مگر ہم نے تو پہلے ہی لڑائی کا سوچا ہوا تھا۔ ایک ہوسٹس عربی میں بولتی چلّاتی زمین پر گر پڑی۔ میں نے دھمکایا کہ اگر کسی نے گولی چلائی تو میں جہاز اڑا دوں گی۔ میں نے اپنے دونوں ہینڈ گرنیڈ دکھائے اور ان کی سیفٹی پنیں زمین پر پھینک دیں۔ اس غرض سے کہ لوگ اس بات پر یقین کر لیں ہم دست بدست لڑائی نہیں کرنی چاہتے۔ پیٹرک نے مسلح سٹیورڈز اور مسافروں کو مجھ سے فاصلے پر سنبھالے رکھا اور مجھے کہا "تم آگے جاؤ، میں تمہارے پیچھے سنبھالے رکھوں گا۔ میں نے ہوسٹس کو کھڑے کرتے ہوئے اپنے آگے آگے چلنے کی ہدایت کی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، وہ عجیب ہذیانی کیفیت میں اندر گئی۔ میں نہ کیپٹن کو دیکھ سکی نہ عملے کو۔ گولیاں چلیں۔ کیپٹن کے کیبن سے پہلے ابھی ایک اور دروازہ تھا۔ ہم

دونوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص ہمیں چور سوراخ سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا گرنیڈ دکھا کر دروازہ کھولنے کو کہا۔ مگر اب پھر اور گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھ پر کئی آدمیوں نے بیک وقت حملہ کیا۔ مجھے لگا جہاز گر رہا ہے۔ گولیاں مسلسل چل رہی تھیں۔ اب اچانک مجھ پر بھیڑیوں کا گروہ حملہ آور ہوا۔ جس میں ایل۔ اے۔ ون کا عملہ اور مسافر دونوں شامل تھے۔ کسی نے چیخ کر کہا: "اس کو مت مارو۔ اس کے پاس دو ہینڈ گرنیڈ ہیں"۔ اب کسی نے مجھ پر گولی نہیں چلائی۔ مگر کچھ لوگ مجھے لاتیں مار رہے تھے اور کچھ کہنیاں۔ کچھ میرے اُوپر سے ہو کر گزر گئے۔ دو میرے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور مجھ سے ہینڈ گرنیڈ چھین لینا چاہتے تھے۔ بلکہ ایک تو مجھ سے گرنیڈ چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا میں نے اپنی پوری قوت سے پکڑا ہوا تھا کہ آخر میں بے ہوش ہو گئی اور وہ لوگ مجھ پر حاوی آ گئے۔

ابھی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پیٹرک کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ مجھے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں کھینچ کر لے جایا گیا۔ جہاں پیٹرک زخمی پڑا تھا اور اس کو سانس بھی اٹک اٹک کر آ رہا تھا۔ صیہونی پاگل کتوں کی طرح پھر رہے تھے۔ وہ میرے جسم کے ہر حصے کو روندتے پھرے۔ اس وقت پیٹرک بھی اتنی بُری حالت میں تھا کہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا ——— میں پنجرے میں قید شیر کی طرح لڑ رہی تھی اور اس وقت تک لڑتی رہی۔ جب تک ادھ موئی ہو گئی پھر ایک ظالم بھیڑیا آگے آیا۔ اس نے میرے بال بے رحمی سے کھینچے اور مجھے کتیا کہا اور ہر قسم کی غلیظ گالیاں دیں۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر کاٹا۔ وہ اور اس کے گرد لوگوں نے مجھے بے تحاشا مارا۔

جہاز معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ باقی سواریاں اپنے اپنے مقام پر بیٹھی تھیں۔ ایک دم کاک پٹ میں سے ایک اسرائیلی گارڈ نکلا اور پیٹرک کو سیدھا کر کے اس کو باندھنے لگا۔ کسی نے پوچھا "وہ کیسے ہیں ؟" ایک آواز آئی ہمیں نہیں معلوم۔ وہ تو..... پریقین نہیں.... وہ تین چوتھائی مر چکی ہے۔" وہ آدمی پیٹرک کے چوتڑوں پر کھڑا تھا اور پیٹرک نے تکلیف سے بے قابو ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کے تو ہاتھ بھی کمر پر بندھے تھے۔ اب صیہونی گارڈ نے پیٹرک کی کمر پر چار گولیاں ماریں۔ کوئی جہاز میں پیچھے سے چیخا "خدا کے لیے یہ خون خرابہ بند کر دو۔" پیٹرک نے میری طرف موت آلودہ مسکراہٹ سے دیکھا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

اب میری باری تھی۔ مجھے بھی اسی طرح باندھا گیا تھا۔ ہاتھ پیچھے اور کمر اور ٹانگیں تاروں سے جکڑی ہوئیں۔ میں نے بھی پیٹرک کی طرح شہیدوں کی صف میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ مگر صیہونیوں نے مجھے نہیں مارا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پیچھے سے آنے والی رحم کی آوازوں سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ وہ تو اسرائیل کے انسانی چڑیا گھر میں مجھے نمونے کے فرد کے طور پر محفوظ کر کے اپنی بہادری کے قصے عام کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت کچھ اگلوانے کے شوق میں' مجھے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ جیسے ہی مجھے باندھ کر فارغ ہوئے۔ پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہم تل ابیب جا رہے ہیں۔ چند لمحوں میں جہاز نیچے آیا اور زمین اب ہمارے نیچے تھی۔ جہاز جیسے ہی رن وے پر آیا' میں سیٹ سے نیچے گر پڑی اور میرے اوپر گارڈ مجھے گھسیٹتا، گالیاں بکتا اور مارتا جا رہا تھا۔ مسافر اتر چکے تھے۔ مجھے باہر ایمبولنس کی آواز سنائی دی۔ یونیفارم میں ملبوس دو افسر آتے دکھائی دیئے ـــــ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں تھے۔ ایک اور افسر فرسٹ کلاس

میں اس جگہ آیا جہاں میں گری پڑی تھی۔ اس نے مجھے سیدھا کرنے کو کہا۔ اسرائیلی افسر نے آواز لگائی "یہ ہماری قیدی ہے۔" "باہر نکل جاؤ۔ یہ ہماری' اسرائیل کی ملکیت ہے۔ پہلے دونوں آدمی زمین پر کھڑے تھے۔ اب اسرائیلی پائلٹ دو برطانوی افسروں کی موجودگی میں کاک پٹ سے باہر آیا۔ میرے نچلے دھڑ پر دو لاتیں رسید کیں اور بے تحاشا گالیاں دیں۔ اتنی گالیاں کہ برطانوی افسروں نے غصے سے اُسے پرے کرتے ہوئے کہا "شرم کرو"۔ اب اور برطانوی افسر اندر آئے معلوم ہو گیا کہ یہ سب سکاٹ لینڈ یارڈ کے تھے۔ کپتان نے پھر غصے میں کہا:

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری حکومت۔ مگر یہ میری قیدی ہے۔ جاؤ تم اس جہاز سے نکل جاؤ۔" برطانوی افسر نے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تین اسرائیلیوں نے مجھے زخمی ٹانگوں کے باوجود ایک طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ برطانوی افسروں نے میرا ہاتھ دوسری طرف کھینچنا چاہا۔ عجب رسہ کشی تھی۔ آخر کو برطانوی جیت گئے۔ ایک بھدّے سے برطانوی افسر نے مجھے کندھوں پر ڈالا اور نیچے کھڑے دو منتظر افسروں کے ہاتھوں پر پھینک دیا۔ اب میں برطانوی ہاتھوں میں تھی مجھے معلوم تھا کہ اب میں تل ابیب سے زیادہ محفوظ تھی۔

برطانوی افسروں نے ایک طرح کی ایمبولنس میں مجھے اور پیٹرک کو ڈالا۔ مجھے موہوم سی امید تھی' شاید پیٹرک ابھی زندہ ہو۔ چند منٹ بعد نرس نے ایک افسر کے کان میں کچھ کہا جو میں نہیں سن سکی۔ پھر اس نے پیٹرک کے منہ سے آکسیجن ماسک اتار لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے برطانوی افسروں سے ہاتھ پیر کھولنے کی اپیل کی۔ انہوں نے مجھے اس شرط پر کھولا کہ میں خاموش رہوں گی۔ میں پیٹرک کے مردہ تن کے پاس کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس کے زخموں کو شمار کیا۔ اس کے چکنا چور سر کو دیکھا اور ایک کامریڈ کی طرح میں نے اس کے

ہونٹوں کو چوما اور پھر میں بے اختیار رو پڑی۔ " پٹرک! اب تم انقلابی محبت میں "پچے" کے ساتھی ہو گئے ہو تم کمزوروں اور مظلوموں کے لیے روحانی رہبر ہو۔ فلسطینی اپنے دلوں میں تمہارا مقبرہ بنائیں گے اور فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے تم جیسے بے غرض اور بے لوث رہنماؤں کو اپنا رہنما مانیں گے۔"

۲۰ منٹ کے اندر اندر ہماری ایمبولنس ہلنگڈن ہسپتال پہنچ چکی تھی۔ پٹرک آرگیولیو عمر ۲۷ سال، شہری نکاراگوا۔ پیدائش سان فرانسسکو (امریکہ) باپ تین بچوں کا۔ مردہ قرار دیا گیا۔ وہ شخص کہ جو دنیا کے وسط میں جا کر ایک خطرناک مشن سرانجام دینا چاہتا تھا۔ پٹرک ایک انقلابی کمیونسٹ تھا۔ اس کا بہادرانہ عمل بین الاقوامی برادری کے لیے تھا، زندگی کا وہ شعلہ سرد ہو چکا تھا۔ جس نے دنیا کو لمحہ بھر کے لیے چکا چوند کرنے والی روشنی دی۔ اس نے فلسطین کی جدوجہد کے راستے کو روشن کیا تھا۔

ہلنگڈن ہسپتال میں میرا جنرل چیک اپ ہوا اور ایکسرے لیے گئے۔ میرے اردگرد لوگوں کا جم غفیر تھا۔ جن کا نہ میڈیکل سائنس سے تعلق تھا نہ ہسپتال سے۔ ڈاکٹر نے مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا اور بظاہر تندرست قرار دیا۔ حالانکہ میری ہڈی ہڈی اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ مجھ سے کسی خاتون نے جو بہر حال نرس نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے کہا " میں پاپولر فرنٹ برائے آزادئ فلسطین کی کمانڈو ہوں"۔ ایک اور آواز زور سے آئی۔ " یہ کوئی نام نہیں ہے۔" " یہ میرا نام ہے۔ میں اور کوئی بات کرنا نہیں چاہتی ہوں"۔ میرے اردگرد لوگ ہی لوگ تھے۔ بیان لینا چاہتے تھے کہ اتنی دیر میں ایک شناسا صحافی کا چہرہ اُبھرا مگر میں اُسے قطعی طور پر شناخت نہ کر سکی۔ اس نے شاید میری آواز پہچان لی تھی۔ اس نے کہا " یہ لیلیٰ ہے"۔ پولیس افسر نے کہا " کون لیلیٰ"۔ " وہی لیلیٰ خالد کہ جس نے

ٹی۔ ڈبلیو۔ اے ۸۴۰ اغوا کیا تھا"۔ صحافی نے جواب دیا۔

" کیا تمہیں یقین ہے"۔ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

" ہاں ہاں بالکل" صحافی نے کہا۔

پولیس افسر اب میرے پاس آیا اور بولا " کیا تیرا نام لیلیٰ ہے"۔ میں مسکرائی مگر اس کے جملے پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے مغربی ڈریٹون پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ میں نے وہاں رات گزاری۔ یہاں پولیس نے مجھ سے استفسار کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں نے ہر بار یہی جواب دیا۔ " میں پاپولر فرنٹ برائے آزادئ فلسطین کی کمانڈو ہوں"۔ میرا یہ جواب اس وقت تک تھا جب تک وہ مجھے بطور کمانڈو تسلیم کر کے مجھے جنگی قیدی والی مراعات دیں۔ مغربی ڈریٹون میں صرف ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا کہ جب امیگریشن افسر کاغذوں کے ایک تھدے کے ساتھ آیا اور مجھے لمبی چوڑی ہدایات دینے لگا اور پھر مجھے بتایا کہ انگلینڈ میں میرا قانونی داخلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا اگر ایسا ہے تو مجھے رہا کر دو۔ اس نے کہا " یہ نہیں ہو سکتا"۔ وہ مجھ سے ان کاغذات پر دستخط کروانا چاہتا تھا اور مجھے کچھ برطانوی غداروں جیسے نام سے پکارنے اور سلوک کرنے لگا تو میں نے اُسے باہر نکل جانے کو کہا۔

پہلی دو راتیں بڑی خوفناک تھیں۔ مجھے پریشانی تھی اُردن کے واقعات کے بارے میں اور دوسرے جہازوں کے اغوا کا احوال بھی معلوم نہ تھا۔ میرا بُرا حال تھا کہ اوں تو میں ایل۔ اے۔ ون جہاز اغوا کرنے میں ناکام رہی تھی اور دوسرے پٹرک کی موت مجھے آدھ موا کر گئی تھی۔ یہ دونوں خیال ہر وقت میرے اُوپر حاوی رہتے۔ میں ایک گھنٹہ بھی سکون سے نہیں سو سکتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے میں ایک جدوجہد میں مصروف ہوں جو اس نقصان کا ازالہ کرے گی۔ میں اکیلی تھی۔ خود سے لڑ لڑ کر

بے حال ہو جاتی تھی۔ جو عورتیں ہر وقت میرے ساتھ رہتیں، میں ان سے کچھ نہ کہتی۔ ان کا میرا ایک ہی فقرے کا رشتہ تھا۔ "کیا وقت ہوا ہے"۔ میری بوریت دور کرنے اور ان سے شناسائی کے لیے یہ فقرہ میں کئی مرتبہ دہراتی۔ ایک دن ایک گارڈ نے مجھے غصہ چڑھا دیا جب اس نے پوچھا۔ "آخر تم نے کیا کیوں؟ یہ تو جناتی کام تھا"۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس کو میں کیا سمجھاؤں۔ بہر حال وہ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتی اور جب پولیس مجھے وہاں سے ایلنگ لے گئی تو اس نے مجھے بہت یاد کیا۔ وہاں سے چلتے وقت اس نے مجھے کمبل اوڑھایا اور میرے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

---

(۴)

مجھے ایلنگ پولیس سٹیشن ۷ ستمبر کو لایا گیا۔ یہاں بھی مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دو خواتین افسروں کو میرے اوپر تعینات کر دیا گیا۔ پہلے پہل دونوں میرے خلاف لگتی تھیں۔ ہماری آپس میں تکرار بھی ہوئی۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار بھی کر دیا۔ میں نے صرف سگرٹ پی یا کالی کافی پی۔ میں نے اخبارات مانگے انہوں نے کہا کہ مجھے خواتین کا اخبار پڑھنے کو دیا جا سکتا ہے۔ اگر میں چاہوں تو....

میں نے انکار کر دیا۔

۸ ستمبر کو میری ملاقات سپرنٹنڈنٹ فرو انسپکٹر بروس اور انسپکٹر لیڈلاس سے ہوئی۔ میں نے ان سے بھی کہا "میں آپ سے اسی وقت بات کروں گی جب آپ مجھے بطور کمانڈو تسلیم کریں گے۔ وہ میری بات ایک شرط پر مان گئے کہ میں جو کہوں گی سچ کہوں گی۔

فرو نے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

"لیلیٰ خالد" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو" فرو نے غصے سے کہا۔

"پھر میرا نام کیا ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر خالد تمہارا بنایا ہوا نام ہے"۔ فرد پھر بولا۔

"میرا بنا ہوا نام شادیہ ابوغزالہ ہے۔ شادیہ ہماری بہت بہادر اور جنگجو خاتون تھیں"۔۔۔ فرد نے میری بات کاٹی اور بولا" براہِ کرم بات کا رُخ کسی اور طرف مت موڑو۔ سیدھے سیدھے جوابات دو"۔ اس نے اب مجھے ایک پستول دکھائی اور اُسے شناخت کرنے کو کہا۔ میں نے کہا یہ پستول ان بہت سی پستولوں میں سے ایک ہے جو اسرائیلی پائلٹ نے میرے منہ پر ماری تھیں پھر اس نے مجھے ایک اور پستول دکھایا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ پستول پٹرک کا تھا۔ مگر اس وقت میں نشاندہی نہ کر سکی۔ البتہ فرد نے میری بات کا یقین نہیں کیا اور آگے سوال کرتے ہوئے ہینڈ گرنیڈ دکھا کر کہا" تمہارے پاس یہ عجیب چیزیں آئیں کیسے ؟ میں نے بڑے اعتماد سے کہا" مجھے یہ پی۔ ایف سے ملی ہیں"۔ "پی۔ ایف"۔ اس نے حیرانی سے دہرایا۔ یہ پاسپورٹ تمہیں کس نے دیا تھا۔" پی۔ ایف" میرا جواب تھا۔" تم جہاز سے کہاں جانا چاہتی تھیں؟"

"کہیں تو، کہیں تو"۔ میں نے جواب گول کر دیا۔

"یہ عبدالرحیم جبار کون ہے؟" اب میں نے کہا کہ ایک چھوٹی سی تقریر ہو ہی جائے، تب ہی یہ بندہ خاموش ہوگا۔ میں نے بولنا شروع کیا:

"جبار ایک فلسطینی ہیرو ہے۔ وہ ہمارا جیالا خفیہ سرگرمیوں کا ماہر کمانڈو ہے۔ کہ جس کا عمل دشمنوں کے دل دہلا دیتا ہے۔ اس نے اسرائیل کے سارے شہروں میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ ۲۱ ستمبر ۶۸ء کو وہ اس لمحے تک لڑا جب تک اس کا سارا دفاعی سامان ختم نہ ہوگیا۔ اس نے دشمن کو اس وقت تک مصروف رکھا جب تک کہ سارے کامریڈ امریکی ہیلی کاپٹر کے ہوتے ہوئے بھاگ نکلنے میں کامیاب

نہیں ہو گئے۔ وہ فلسطینی کسانوں کے رہنما تھے اور ان کے ذریعے انقلاب کا پیغام پھیلاتا تھا۔ اس کا سب سے دلیرانہ قدم جنرل شریف ناصر کو چیلنج کرنا تھا جنرل شریف ناصر، شاہ حسین کا چچا تھا۔ وہ اردنی پلاٹون کو خطاب کر رہا تھا۔ یہ رجعت پسند پلاٹون یمن بھیجی جا رہی تھی تاکہ مانع انقلاب قوتوں کو مستحکم کر کے معزول امام کو پھر مسندِ حکومت پر متمکن کرے۔ جبار نے اٹھ کر شریف ناصر سے کہا کہ بجائے ہمیں یمن بھیجنے کے اور پھر ہمیں یمن ریڈیکل اور یو۔ اے۔ آر کی فوج سے لڑوانے کے، ہمیں تل ابیب کیوں نہیں بھجوایا جاتا کہ ہم اسرائیلیوں کو ختم کریں "شریف ناصر کا ہاتھ بہت بندوق پر بہت جلدی پہنچتا تھا۔ مگر اس نے دیکھا کہ ادھر اس نے کوشش کی اور اس سے پہلے جبار نے بندوق تھام لی تھی۔ جبار کو معزول کر دیا گیا۔ مگر اس نے اپنی عزت بنائی۔ دشمن نے اُسے چار ماہ تک اذیتیں دیں کہ وہ گڑگڑا کر معافی مانگے۔ مگر دشمن ناکام رہا۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں بھی اُسی مٹی اور اُسی خمیر کی بنی ہوئی ہوں۔ اب شاید آپ کی سمجھ میں آگیا ہو کہ میرا لیونٹ "عبدالرحیم جبار کمانڈ یونٹ" کیوں کہلاتا ہے۔

برطانوی افسر نے سارا قصہ غیر جذباتی انداز میں سنا۔ جب میں نے بات ختم کی فرد نے پھر سوال شروع کر دیئے" یہ نوٹ ۔۔۔۔ جو آپ نے لکھا ہے۔۔۔۔ اس میں تحریر ہے، شادیہ اور اس کے ساتھی۔۔۔۔ یہ آپ کے ساتھی کون ہیں"۔

"کون ساتھی"؟ میں نے بھی رعونت سے کہا۔ پھر ذرا سا وقفہ کیا اور پھر بولی" ممکن ہے جہاز میں اور لوگ بھی ہوں جنہیں میں پہچانتی یا جانتی نہ ہوں۔ کیوں! کیا آپ کو ان میں سے کوئی ملا ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

فرد نے اب ذرا غصّے سے کہا" مس خالدہ! میرے بال سفید ہوگئے ہیں"۔

"یہ میری وجہ سے نہیں، بلکہ اس لیے ہیں کہ آپ کی بیوی لڑاکی ہے"۔ میں

نے بات کاٹ کر کہا۔

اس پر فرد مسکرایا اور بولا "تم ذہین خاتون ہو۔"

"مجھے ایسی تعریف نہیں چاہیئے" میں نے غصے سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

بہرحال یہ زبانی لڑائی کافی دیر چلی۔ میں نے کافی برہمی کا اظہار کیا اور تینوں کو یہ بتایا کہ میں عرب فلسطینی عورت ہوں اور ایسے فاسسٹ سؤروں کے تعریفی کلمات تسلیم نہیں کر سکتی کہ جنہوں نے مجھے قیدی بنا کر رکھا ہوا ہو۔

اب فرد نے اپنے کاغذات کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا "تو جناب یہ بتایئے کہ آخر عرب فلسطینی عورت کو اس جہاز کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کی کہ جس میں عرب فلسطینی ہی تو تھے!" میں اس سوال سے برافروختہ نہیں ہوئی۔ میں نے کہا:

"اوہو! فیصلہ تو آپ نے کیا ہوا ہے کہ مجھے مجرم ثابت کرنا ہے چاہے جرم میں نے کیا ہو کہ نہ کیا ہو۔"

"تمام شہادتوں نے کہا ہے کہ تم نے جہاز اڑا دینا چاہا" فرد نے کہا۔

"وہ تمام صیہونی جھوٹے فریبی ہیں" میں نے کہا "اور پھر آپ عوامی تفتیش کریں۔ ہر گواہ پر عام جرح ہو۔ سچ سب کو پتہ چل جائے گا۔"

اس نے اس سوال کو فوری رد کرتے ہوئے کہا "مس خالد! کیا تم سمجھتی ہو کہ تم بزدل ہو۔"

دیکھو..... مجھے حکم تھا جہاز اغوا کرنے کا، تباہ کرنے کا نہیں۔ میں کیکاز پائلٹ نہیں ہوں۔ مجھے لوگوں سے پیار ہے۔ اگر میں جہاز اُڑانا ہی چاہتی تو مجھے وہاں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔"

"تم جہاز میں کہاں سے چڑھیں۔ تل ابیب سے؟" فرد نے پوچھا۔

"میں ایمسٹرڈم میں شیفول ائیرپورٹ سے چڑھی تھی۔"

اب تمہارے ذہن میں اور کتنے جہازوں کے اغوا ہیں۔" فرد نے پوچھا۔

کوئی نہیں۔"

"ابھی دو اور ہو گئے ہیں۔"

میں یہ سن کر حیران اور خوش ہوئی۔

"اسرائیلیوں نے تمہیں واپس مانگا ہے" فرد نے کہا۔

"واپس مانگنے کا کیا مطلب ہے" میں نے پوچھا

"مطلب یہ کہ تم ان کی مجرم ہو۔ وہ تمہیں سزا دینا چاہتے ہیں۔"

خیر! مسٹر فرد! شاید آپ بھی اسرائیلیوں کے اذیت گھروں سے واقف ہوں ان کے جسمانی تکلیف کے طریقے اور دوسرے مظالم۔ مجھے سب معلوم ہیں۔ میرا جی کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی ان کا علم ہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انہیں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ صرف ایک عدد کا اضافہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ میں صیہونی اذیت سے تنگ آ کر شکستہ نہیں ہوں گی۔

"تم واقعی ذہین لڑکی ہو" فرد نے پھر کہا۔

"میں نے کہا نا! میں تم جیسوں کے تعریفی کلمات قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں۔ لاؤ مجھے ایک سگرٹ اور پانی دو" میں نے مذاقاً کہا۔

اس ذرا سے بہتر ماحول میں، میں نے افسروں کو کہا کہ میں نے برطانوی حکومت کے خلاف کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے نہیں پتہ چل رہا کہ آخر مجھے کیوں جیل میں رکھا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو انہیں بھی پتہ نہیں ہے۔

میں نے پوچھا "کیا کوئی اسرائیلی بھی جیل میں ہے؟"

"نہیں" انہوں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ انہوں نے میرے کارڈ کو بے دردی سے مارا ہے۔"

"تمہارا ساتھی لڑتے ہوئے مارا گیا ہے۔ سرکاری بیان ہے کہ تمہارے ساتھی کی موت مبنی بر ضرورت تھی"۔

"شرم کریں برطانوی عدالتیں۔۔۔۔۔ وہ متعصبانہ گواہی کی بنیاد پر ایسے فیصلے کر لیتی ہیں اور یہ فیصلہ کہ جس میں مجھ سے پوچھ گچھ لازمی تھی۔ میرے بغیر کیسے ہو گیا؟ میں پھر چیخی "تل ابیب سے واشنگٹن تک ایک ہی طرح کے تار ملتے ہیں۔۔۔۔ یہ برطانوی انصاف ہے"۔

مجھے اتنے غصے میں دیکھ کر مجھے میرے سیل میں لے جایا گیا۔ اسی شام میرے سر میں شدید درد تھا۔ گارڈ نے مجھے غور سے دیکھا کہ میں بے چینی میں اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کر رہی تھی۔

۹ ستمبر کو مسٹر فرو نے مجھ سے پھر ملاقات کی۔ انھوں نے پوچھا کہ میں کس ملک میں جانا پسند کروں گی۔ اگر میں مجرم پناہ گزین قرار دی جاؤں۔ میں نے کہا کہ اپنے وطن فلسطین میں۔ میں نے یہ اصرار بھی کیا کہ مجھے فوراً رہا کیا جائے۔ میں نے اپنی رہائی میں تاخیر کو ان کے حق میں بُرا قرار دیتے ہوئے نتائج کے لیے خود بھی ذمہ دار رہنے کی تنبیہ کی۔ اسی دن بی۔او۔اے۔سی، وی سی ۱۰ اغوا ہوا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب میری رہائی یقینی ہو گی۔ مسٹر فرو اس شام میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے تو معلوم ہو گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا "فرنٹ کو تو پتہ ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ مجھے برطانوی عدالت کی کانک کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی سفارش پر ہی میری قسمت کا فیصلہ ہو"۔

۱۰ ستمبر کو مجھے پٹرک کا ہیولا یاد آتا رہا۔ میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی میں کچھ نہ کھا سکی کہ پٹرک تو بھوکا ہی مر گیا تھا۔ مجھے روز کھانا کھاتے وقت یہ یاد آتا۔ میٹرن مجھے تسلی دیتی۔ وہ ایک مہربان اور نیک خاتون تھی۔ وہ مجھے نصیحت

بھی کیا کرتی۔ مگر غصے اور اداسی کے جذبات، چند تسلی کے الفاظ سے سکون بھی تو نہیں پاتے ہیں۔ میں البتہ اس بات سے خوش تھی کہ بی۔او۔اے۔سی کا طیارہ اغوا کر کے پی۔ایف مسافروں کے بدلے میری رہائی کا مطالبہ کر رہی ہے۔

مسٹر فرو میرے پاس آئے اور پٹرک کے پاسپورٹ کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہا "لیلیٰ تمہارا پارٹنر کون تھا؟" اب مسٹر فرو نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"میرا نام لیلیٰ نہیں بلکہ مس لیلیٰ خالد کمانڈو پاپولر فرنٹ ہے۔ اب آپ سمجھے مسٹر فرو!" وہ ابھی میرے اس رویے پر حیران تھا کہ میں مزید بولی "آپ کے اپنے قوانین کے تحت آپ کو اس وقت بلا خاتون ساتھی کے یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے اور ہاں مجھے برطانوی انصاف کے سامنے کب پیش کیا جائے گا"۔

اب تو فرو بالکل پریشان ہو گیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ الفاظ بڑبڑائے اور پھر دروازہ کھولنے کو مڑا۔ اب وہ معذرتاً پوچھ رہا تھا کہ اگر وہ میرے کسی کام آ سکے۔ میں نے کہا "ہاں میں اپنے کمانڈوز کے لیے سوئیٹر بننا چاہوں گی۔ آپ براہِ کرم مجھے اون سلائیاں فراہم کر دیجیے"۔

اس نے وعدہ کیا، مگر ساتھ ہی بتایا کہ قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ میں نے کاغذ اور پنسل مانگی۔ اس نے مجھے دو انچ لمبی پنسل دے دی۔ ہر چند مجھے غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی اور دانت میں درد بھی تھا۔ پھر بھی میں نے پٹرک کی یاد میں ایک نوٹ لکھا:

"آج سے ۴ دن قبل ہم اپنے غیر فانی سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ تمہاری روح میرا اندر امید سے بھر دیتی ہے کہ ہم جس مقصد کے لیے گئے تھے وہ عزت اور انصاف کی قدروں پر مبنی تھا۔ تم نے ان لوگوں کے لیے اپنی جان دی۔ جن کو تم نہیں جانتے تمہاری اپنی سرزمین، میرے برِاعظم میں رہنے والے وہ لوگ کہ

جنھوں نے تمہاری تصویر تک نہیں دیکھی۔ ہر چند میں تمہیں نہیں جانتی۔ مگر میں تمہیں اپنی زندگی میں شناسا ہر شخص سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے علم کے مطابق ہر ہیرو اور اپنے جذبات کے حوالے سے ہر خواب سے زیادہ جانتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ ان لوگوں کو جاننے کی خواہش رہی ہے۔ جو اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کو پیار کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کی مدح کی ہے جو آزادی کے مقصد کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان لوگوں کی پرستش کی ہے جو سورج کی تیز کرنوں کی پرواہ کئے بغیر ننگے بدن شان سے چلتے ہیں اور روشنی، زندگی اور ترقی کے دشمنوں کو حرفِ انکار سے نوازا ہے۔

تم نے فلسطین کی خاطر مر کر، ہماری مظلومیت کی مرکزیت حاصل کر لی ہے۔ تمہاری روح ہم سے مظلومیت دور کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تم نے ہماری جد و جہد میں شامل ہو کر ہمیں بین الاقوامی بھائی چارے اور سلامتی کا درس دیا ہے۔ یوں لاطینی امریکہ اور فلسطین کے عوام کو ایک تسبیح میں پرو دیا ہے۔ تم نے اپنا خون بہا کر تاریخ لکھی ہے۔ تم نے اپنی جاوداں روح سے برِاعظموں کو ملا دیا ہے۔ تم نے عمرِ جاوداں حاصل کر کے دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر لیا ہے تم بیک وقت لیفیٹ، بائرن، فارمن بیتھون، چے گویرا، پیٹرک آرگیولیو اور فلسطینی حریت پسند ہو۔ تم مرے نہیں۔ تم زندہ ہو۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ تم فلسطینی انقلاب کے روحانی پیشوا ہو"۔

لیلیٰ"

۱۱ ستمبر کا دن دل لگی کا دن تھا۔ دن کا آغاز ہنڈراس کے سفیر کی آمد سے ہوا۔ لحیم شحیم۔ بڑی بڑی مونچھوں والا۔ بڑا زمیندار جیسا۔ مسٹر فرد نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "ہز ایکسیلنسی کونسل آف ہنڈراس"۔ اس نے پوچھا،

"یہ تمہارے پاس ہنڈراس کا پاسپورٹ کیسے آیا"

میں نے سوال سن کر حقارت سے جواب دیا "کیا پاپولر فرنٹ نے آپ کو بھیس بدلوا کر اور مصنوعی بنا نا جمہوریہ کے سفیر کی حیثیت سے بھیجا ہے"۔ ہز ایکسیلنسی تو یہ سن کر بھنا گیا۔ وہ تو نچڑے ہوئے نپولین کی طرح واپس ہو گیا۔ سرکاری ہرکاروں کے لیے کس قدر افسوسناک صورتِ حال تھی کہ ایک لاطینی کونسل کا مضحکہ ایک نامعلوم ہائی جیکر اور ایک فلسطینی اُڑا رہی تھی۔ بہت بے عزتی اور غصے کی بات تھی۔ مگر مسٹر فرد کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں نے مسٹر فرد کو یاد دلایا کہ وہ اُون اور سلائیاں لانے کا وعدہ ابھی تک پورا نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے مجھے سمجھایا "تمہیں اپنے پاس کسی قسم کی تیز دھار کا آلہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے"۔ یہ بات کہتے ہوئے دراصل وہ یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا واقعی فرنٹ مسافروں سمیت جہاز کو اڑا دے گی۔ اگر اس کے مطالبات نہ مانے گئے۔ میں نے بلا توقف کہا "ہاں.... بالکل" مسٹر فرد نے چمک کر کہا "کیا تم لوگوں میں بالکل انسانیت نہیں ہے... انسانیت! شرم کرو۔ ان کے استعمال پر ہیں بھی چیخی"۔ اگر تم میں ذرا سی بھی شرم ہے تو اپنی لغت سے اس لفظ کو خارج کر دو"۔ اب میں نے سامراجیت، صیہونیت، برطانوی زندگی اور عرب دنیا کی بربریت پر بات شروع کی مگر مسٹر فرد نے تو مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا "براہِ کرم تقریر ختم کیجئے! مس لیلیٰ خالد! ہماری حکومت ہے ہی سامراجی"۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ میں نے اپنے محافظوں سے پوچھا کہ مسٹر فرد نے حکومت کی حمایت کیوں نہیں کی۔ انہوں نے بتایا کہ انگلینڈ میں لیبر پارٹی کے بہت سے ممبران ہیں جو کہ قدامت پرست حکومت کے حق میں نہیں ہیں۔

۱۲ ستمبر کو میں نے جب یہ سنا کہ سامراجیوں کے جہاز اڑا دیئے گئے ہیں، تو

میں نے بھی اپنا رویّہ بدلا۔ اس زمانے میں برطانیہ میں طرح بہ طرح کی ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میرے محافظ بھی اپنے ساتھی کارکنوں کی حمایت میں ہڑتال کریں۔ میں نے تجویز کیا کہ چونکہ وہ میرے "قیدی" بنے ہوئے تھے۔ اس لیے انہیں بھی انقلاب لانا چاہئے اور ساتھی کارکنوں کی حمایت میں ہڑتال کرنی چاہئے میں جس وقت انہیں بغاوت پر اُکسا رہی تھی۔ مسٹر فرو اندر آ گئے۔ اس نے اندر آتے ہی لمبی سانس لے کر کہا "تم آخر کرنا کیا چاہتی ہو؟" میں نے کہا "ان قیدیوں کو رہا ہونا چاہئے"۔ "کون سے قیدی؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ جو صبح شام کام کرتے رہتے ہیں۔"

"اچھا چلو! اس دفعہ تم جیت جاؤ۔ دیکھوں تو کیا کرتی ہو؟" مسٹر فرو نے بڑی پدرانہ شفقت سے کہا۔ مسٹر فرو اپنی فائلیں چیک کر رہے تھے۔ میں نے بولنا شروع کر دیا "مجھے معلوم ہے کہ وزارتِ داخلہ، برطانوی انصاف کی خلاف ورزی کر رہی ہے، نہ کسی کو ہیبیس کورپس کی پرواہ ہے نہ کسی اور قانون کی۔ گر اینگ ملٹن کو صحت و صفائی کے قوانین کی خلاف ورزی پر آخر مسٹر فرو سے احتجاج کرنا پڑے گا۔"

انہوں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ تم اور کیا کرنا چاہتی ہو۔ میں نے غصے سے کہا "آپ کو معلوم ہے میں نے گزشتہ چھ دن سے غسل نہیں کیا ہے۔" انہوں نے فوراً پانچویں منزل پر میرے نہانے کے انتظام کا حکم دیا۔ میں چار پولیس میٹرنز کی موجودگی میں لے جائی گئی۔ ان بیبیوں نے اپنی موجودگی میں مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ کہ وہ چاروں کمرے کے چاروں کونوں میں فرض کی انجام دہی کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

۱۳ ستمبر، میرے لیے بہت بُرا دن تھا۔ میں سارا دن بیمار رہی اور رات کو بھی نہ سو سکی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے مجھے پنیر سنڈوچ اور کافی پینے کے علاوہ بھی کچھ کھانے کو کہا اور مجھے نیند کے لیے دو گولیاں دیں۔ ان گولیوں کا مجھ پر بہت بُرا اثر ہوا۔

یہ رات، میرے علاوہ ہر ایک کے لیے مصیبت تھی۔ میں بالکل قریبِ مرگ تھی۔ مگر میں یہ محسوس کرتی اٹھی جیسے میرے سر کا وزن ایک ٹن ہو۔ جب میں نے صبح پانچ بج کر ۲۵ منٹ پر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ چھوٹی سی پیاری سی نرس تو بہت ہی خوش ہوئی کہ مجھے ہوش آ گیا ہے۔ میرے علاوہ اس رات ہر محافظ نے جاگ کر رات گزاری تھی۔

اگلے دو ہفتے بس یونہی معمول کے مطابق گزر گئے۔ مجھے سیڑھیاں کا کمرہ استعمال کرنے اور دس گز تک بغیر محافظ گھومنے کی اجازت مل گئی۔ ۷ ستمبر کے بعد کے واقعات خاص کر اردن میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات، میرے ذہن پر حاوی تھے۔ مسٹر فرو اور دوسرے افراد کے ساتھ بحث بھی انہیں معاملات پر جاری رہتی۔ مجھے خطوں کا ایک بنڈل دیا گیا کہ جس میں کچھ افراد نے میری حوصلہ افزائی کی اور کچھ نے مجھ پر تنقید کی تھی۔ ایک خط میں شادی کی پیش کش بھی تھی۔ مجھے کسی خط کا جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ والدین اور قریبی دوستوں کو خط لکھنے کی اجازت تھی۔ میں خطوں کا ترجمہ کرنے کی بھی پیشکش کی۔ مگر مسٹر فرو نے بتایا کہ برطانوی حکومت اپنے مترجموں پر اعتماد کرتی ہے۔

ادھر اردن میں خون خرابہ اپنے عروج پر تھا۔ اور میں قید میں صرف احتجاج اور حسین کے رویّے پر ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔ برطانوی پریس سے معلوم ہو رہا تھا کہ نومبر ۶۸ سے شروع ہونے والی دہشت گردیاں اور خوف و ہراس مسلسل جاری تھے۔ بادشاہت کو بچانے کے لیے سارا ملک قربان کر دینے کا حوصلہ کارفرما نظر آ رہا تھا۔

بہت سوں نے پی۔ ایف۔ ایل۔ پی پر بھی یہ الزام لگایا کہ وہ ستمبر ۷۰ء کے ملک گیر قتل و غارت گردی کے منصوبے میں اردنی حکومت کی اعانت کر رہی تھی اور اسی اعانت میں جہازوں کے تین اغوا بھی شامل تھے۔ فلسطینی انقلاب سے متعلق تنظیمات کو ختم کرنے کی اردنی حکومت کی یہ کوشش کسی طرح بھی عوام کے لیے

قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ یہ فلسطینی مزاحمتی انقلابی تحریک کو عرب بادشاہت عمومی طور پر اپنے اقتدار کے تسلط کے لیے ایک الارم کی طرح سمجھتی تھی کہ فلسطینی عوام میں مقبولیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ ان ہنگامی مہینوں میں ایک اور بات کھل کر سامنے آئی کہ حسین، اسرائیل کو اپنی سلطنت" پر قابض ہونے کی دعوت دینے کو تختہ الٹنے کی کوشش کے مقابلے میں صائب حل تصور کرتا تھا۔ امریکیوں تو ہر قیمت پر عوام کو قربان کر کے حسین کی حکومت برقرار رکھنے کا گر آزمایا۔ اس ڈرامے کے کرداروں میں حشمتی حاکمیت زدہ خاندان پیش پیش تھا۔ دیگر عرب ریاستیں عمومی طور پر خاموش تھیں کہ وہ تو گو لڈا میئر اور نکسن کی واشنگٹن میں مرتب کردہ سازش کو عملی طور پر منکشف ہوتے دیکھ کر بعد از وقوع صرف افسوس کی قائل تھیں۔

(۵)

۱۷ ستمبر کو برطانوی محافظوں نے نہ معلوم اپنی ہی دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے کہ اپنے آقاؤں کے حکم پر مجھے مشورہ دیا کہ میں سیاسی پناہ کے لیے درخواست دوں۔ میرے لیے یہ سیاسی بددیانتی تھی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ مجھے رہا کیا جائے کہ میں اردنی کامریڈز کے ساتھ لڑائی میں حصہ لے سکوں۔ برطانوی حکام نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے' امریکی اور اسرائیلی دباؤ کے تحت "برن فائٹ" کے نام نہاد معاہدے پر شراکتی درجے پر آ کر بات چیت کی۔ مجھے یقین ہے کہ جرمن، سوئز اور برطانوی حکّام نے یرغمالیوں کے عوض قیدیوں کے تبادلے کو منظور کر لیا ہوتا۔ اگر یورپی اقوام کو اپنے ممالک کے مفادات ہمارے مقابلے میں اولیت حاصل کر لیتے۔ بین الاقوامی قانون کی عملداری کے نام پر ان سنگدلانہ اقدامات کو مبنی برحقیقت شمار کرتے ہوئے "معصوم مسافروں" کی مدافعت کا عنوان دیا جا رہا تھا

اردن میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ مجھے مضطرب کئے ہوئے تھا۔ میں ہر چند بظاہر

پرسکون اور مطمئن رہنے کی کوشش کرتی۔ مسٹر فرو، روز آنے والے لوگوں میں تھے وہ حیران تھے کہ مسلمان، دشمن سے لڑنے کی بجائے آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ میں نے انہیں طبقات میں بٹے معاشرے کی نفسیات اور ردِ عمل کا ڈھانچہ سمجھایا پھر یہ بھی بتایا کہ علاقے کا بادشاہ بھی دشمن کے کیمپ سے متعلق تھا۔ مسٹر فرو نے میری بات غور سے سنی مگر دیگر مغربی مبصرین و مفکرین کی طرح وہ بھی طبقاتی کشمکش کے اثرات اور تاریخی مضمرات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ البتہ اس نے مجھے اتنی تلخ باتیں کرنے سے منع کیا، جبکہ میری رگ رگ میں یہ یقین سرائیت کیا ہوا تھا کہ اردن میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہی سماجی ہمواریت کا آغاز بن سکتا ہے۔ میری طبقاتی تجزیاتی خصلت کو پرکھنے کے لیے ایک ہفتہ بطور آزاد شہری رہنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا کہ میں رہا ہونے کے بعد کرسمس تک برطانیہ میں رہنا چاہوں گی کہ برطانوی جمہوریت کا لطف "لے سکوں"۔ مسٹر فرو نے میرے طنزیہ لہجے کو محسوس کیا اور کہا "اب بہتر یہ ہے کہ تم اُردن چلی جاؤ۔ ورنہ کہیں میں اپنی بیوی کو نہ چھوڑ دوں۔" "جناب بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کو بتا دیں کہ وہ پریشان نہ ہوں کہ مجھے پدرانہ خاصیت کے برطانوی افسر سے شادی کرنے کا شوق نہیں ہے۔ میں تو کسی عرب انقلابی یا سادہ عرب کسان سے شادی کرنا پسند کروں گی نہ کہ کسی برطانوی رئیس یا یونانی تاجر یا امریکی صنعت کار سے۔ مسٹر فرو اب آپ کی سمجھ میں بات آگئی ہے؟"

برطانوی پریس میں اردنی جنگ سے جو کچھ شائع ہوتا وہی مجھ تک پہنچتا۔ اب شامی افواج کی دخل اندازی کی خبریں بھی آنی شروع ہوگئی تھیں۔ امریکی اسرائیلی جارحیت کی مذمت کی خبریں بھی شروع ہوگئیں۔ یہ اطلاعات بھی آنے لگیں کہ شامی ایجنٹوں" کو "اردنی بہادر افواج" ٹھکانے لگا رہی ہیں۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اُردنی حکومت کے زوال کے امکانات پھر معدوم ہو رہے تھے۔ مگر جب میں نے حسین عرفات کو بادشاہوں

اور صدروں کے درمیان ہاتھ ملاتے دیکھا تو مجھے احساس ہوا جیسے انقلاب کی کمر میں چھرا گھونپا جا رہا ہو۔ اگر میں ہوتی تو میں نے کانفرنس کے شرکاء کو گولیوں سے اڑا دیا ہوتا۔ مجھے نوشتۂ دیوار نظر آ رہا تھا کہ مزاحمت کو تاریخی ورثے کے طور پر دفن کیا جا رہا تھا۔ مجھے اس خون کے رائیگاں جانے کا ملال ہو رہا تھا کہ جو ہلٹن قاہرہ، تجا محل اور عرب لیگ ہیڈکوارٹرز کے علاوہ اردن کی گلیوں میں بہتے بہتے اپنی شہادت کے لیے ہمیں پکار رہا تھا۔ میں عرب لیگ کو پٹرک کے خون کے تاوان سے مبرّا نہیں کر سکتی کہ اس کی لاش اب بھی مردہ خانے میں پڑی تھی اور اُدھر منفیِ انقلاب" امن منصوبے" پر دستخط کئے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ مجاہدین اس معاہدے کو نہیں مانیں گے اور موجودہ قیادت کا امتحان لیں گے اور یہ کام فرنٹ کے کارکن ہی کر سکتے ہیں۔ اگلے چند مہینوں میں عرفات اور ان کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بنیادی بات نہیں آ رہی تھی کہ عرب کے قبائل روایتی سماج کے مقابل فلسطینی عرب انقلاب کی بات بنیادی تبدیلیوں کی خواہاں تھی۔ حسین نے جولائی ۱۹۷۱ء کے آپریشن کے ذریعہ گوریلیوں کو قطعی نیست و نابود کرنے کی مہم چلائی۔ اس کے باوجود سعودی۔ مصر، مصالحتی کمیٹی بہت سوں کو قابلِ قبول ہوئی اور مصر کے حسن، حسین کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ بھی۔

۲۸ ستمبر کو اطلاع ملی کہ صدر ناصر مر رہے ہیں۔ مجھے نہ خبر پر یقین آیا نہ ان کی موت کے بعد ہونے والے واقعات ہولناک محسوس ہوئے کہ میں تو عرفات حسین مذاکرات کا سن کر ششدر رہ گئی تھی کہ شام تک ناصر کی وفات کی خبر آگئی۔ جو بات شبہے میں میرے اندر درد پیدا نہ کر سکی، یقین میں بدلنے پر مجھے افسردہ تر کر گئی۔ بچے گویا در ہوچے منہ کی موت میرے اندر پھر تازہ ہوگئی۔ اس کی شدت اور بھی زیادہ تھی کہ اول میں عرب تھی اور دوسرے ناصر کی بے پناہ مداح تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا ایک حصہ مر گیا ہے، مگر

مجھے خوشی بھی تھی کہ میں ناصر کے زمانے میں زندہ رہی ہوں اور اس وقت زیادہ خوش ہوں گی جب آزاد فلسطین میں رہنا مجھے نصیب ہوگا۔

مسٹر فرد اور میرے ارد گرد دوسرے حضرات نے دیکھا کہ میں کتنی ملول تھی وہ اس بات پر حیران تھے کہ کل تک میں جس شخص کو مطعون کر رہی تھی۔ آج اُسی کے لیے غمزدہ بھی تھی۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میری دنیا میں سامراج سے لڑنے والا فرد واحد ناصر ہی تھا۔

۲۹ ستمبر کو مسٹر فرد نے بتایا کہ شاید مجھے رہا کر دیا جائے۔ میں نے اشارے بھانپنے کے لیے اخباروں کا بغور مطالعہ کیا، خاص کر جب آخری چھ یرغمالی بین الاقوامی ریڈ کراس سب کمیٹی کے سپرد کئے جا رہے تھے۔ یہ آخری مرحلہ ۱۳ ستمبر ۷۰ کو مکمل ہو چکا تھا۔ جس لمحے یرغمالی سائپرس پہنچے ہوں گے۔ مجھے بھی تیاری کا حکم ملا۔ میری منزل کا علم نہ تھا۔ میں نے برطانوی دوستوں کو الوداعی بوسہ کیا اور ایلنگ ملٹن میں بہت سے نئے مہمان بھیجنے کا وعدہ کیا کہ یہاں محافظ اور جگہ دونوں مفت ہی ملتے ہیں۔

صبح ساڑھے چھ بجے مسٹر فرد میرے پاس آئے اور پوچھا کہ میں کون سے ملک جانا پسند کروں گی۔ میں نے پھر اعتماد سے کہا "کمانڈروں نے یہ فیصلہ تو خود ہی کر لیا ہوگا، ویسے مجھے کس ملک میں بھیجا جا رہا ہے؟"

مسٹر فرد نے جواب نہیں دیا بلکہ اگلے کئی گھنٹے تک کسی نے بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ چونکہ میں خود ایک سپاہی ہوں، اس لیے قاعدے قانون کی پاسداری میرا فرض ہونا چاہیئے کہ مجھے برطانیہ سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ میٹرنوں نے بتایا کہ گلیوں میں لوگ قطاریں بنا کر کھڑے ہو رہے ہیں کہ مجھے ایک نظر دیکھ سکیں مگر وہ سب مایوس ہوں گے کہ مجھے تو بند [illegible] میں لے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

میں یہ دیکھ حیران رہ گئی کہ میری گاڑی کے ساتھ پولیس کی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا پورا قافلہ پہریداری کے لیے ساتھ تھا۔ میں نے ایک نظر ایلنگ پولیس سٹیشن کے باہر مجمع کو دیکھا پھر مجھے ملٹری ایئر پورٹ لے جایا گیا۔ جیسے ہی میں ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئی میں نے فوٹوگرافروں کے سامنے فتح کا نشان ہاتھوں کی انگلیوں سے بنایا۔ مسٹر فرد کو الوداع کہا اور ایک دفعہ پھر ایلنگ آنے کا وعدہ کیا۔ اس پر فرد نے چیخ کر کہا "نہیں، برطانیہ آنا۔ ایلنگ نہ آنا۔"

ہم کوئی ایک گھنٹے تک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ پرواز کرتے رہے۔ ایک بے نام سے ایئر پورٹ پر اُترے۔ میں نے کیپٹن سے کہا کہ ہوائی جہازوں سے زیادہ مشکل ہیلی کاپٹر اغوا کرنے ہوتے ہیں۔ کپتان کی سمجھ میں میرا طنزیہ فقرہ نہیں آیا۔ اب ہم پھر ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے، پھر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اب ایک شخص نے دوسرے سے کہا "ابھی تو ایک اور عورت کو آنا ہے"۔ مجھے پتہ تھا کہ ان کی مراد امینہ دھبور سے ہے جو کہ زیورچ میں سوئس لوگوں کی قید میں تھی۔ اب ہم اچانک میونخ میں اتر گئے۔ یہ فوجی ہوائی اڈہ تھا۔ کھڑکی سے میں نے مسلح گارڈیاں کھڑی دیکھیں۔ مجھے جہاز میں آخری سیٹ پر بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ ایکشن آرگنائزیشن کے تین افراد، صفیہ عبدالرحمٰن، خابی اور نشاط کو بھی اس جہاز میں لاکر بٹھایا گیا۔ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگلا پڑاؤ زیورچ میں تھا کہ جہاں سے امینہ، کامریڈ ابراہیم توفیق اور محمد ابوالہائجہ، جہاز میں سوار ہوئے۔ میں کم از کم امینہ کو سلام کرنا چاہتی تھی۔ مگر اجازت نہ ملی۔ ہم نے دور ہی سے ایک دوسرے سے دعا سلام کیا۔ ہر مسافر کے لیے الگ الگ باڈی گارڈ تھے۔ مگر ہم میں سے کسی کو ہتھکڑی نہیں لگی تھی۔ ۳۰ ستمبر کی رات بہت طویل تھی۔ قاہرہ تک کا سفر مجھے زندگی کا سب سے لمبا سفر لگا۔ ہمیں لوٹے

وقت بیٹھے رہنے کا حکم ملا۔

یکم اکتوبر کی صبح آٹھ بجے ہم قاہرہ پہنچے۔ شہر میں صدر ناصر کی موت کا سوگ تھا۔ ائیرپورٹ پر ہمیں برطانوی، سوئز اور جرمن کونسل ملے۔ ہم میں سے ہر فرد کو سرکاری طور پر الگ الگ مصری حکام کے حوالے کیا گیا۔ مجھے یہ بڑا عجیب لگا کہ ہمارے ساتھ پیٹرک کی لاش نہیں آئی تھی مگر کوئی برطانوی نہ ملامت کر رہا تھا نہ عرب رہنما ہمیں ڈرا رہا تھا۔ ہمیں مصری مہمان خانے لے جایا گیا اور گیارہ دن تک وہاں رکھا گیا۔ جواز' حفاظت اور ہماری سلامتی تھا۔

۱۲ اکتوبر کو ہمیں دمشق بھیج دیا گیا اور ہر کمانڈو نے اپنے اپنے یونٹ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ بیروت واپس آنے سے پہلے میں اپنے دوست کرنل علی زازا سے ملی۔ یہ وہی صاحب تھے کہ جنہوں ٹی۔ڈبلیو۔ اے قصے میں مجھ پر مصری انٹیلیجنس میں کام کرنے کا الزام لگایا تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "کرنل اب تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ پاپولر فرنٹ یا اس کے کارندے کسی کے آلہ کار نہیں ہیں۔ کیا آپ ابھی مجھے اپنے مہمان خانے میں رکھنا پسند کریں گے؟"

"نہیں لیلیٰ! اب تم میرے ساتھ لنچ کھاؤ تو بڑی عنایت ہو" کرنل نے کہا

"جی شکریہ! مجھے بیروت میں اپنے یونٹ میں جا کر دو گھنٹے میں رپورٹ کرنا ہے۔ خدا حافظ۔ فلسطین کے محاذِ جنگ پر آپ سے ملاقات ہوگی۔

وسط اکتوبر میں، میں بیروت گئی اور یہاں ایک پریس کانفرنس الحدث کے دفتر میں کی۔ میں نے بتایا کہ پیٹرک کو اسرائیلیوں نے قتل کیا اور برطانوی حکومت نے اپنے فضائی علاقے میں ہونے والے جرم پر اعتذار کیا۔ آج برطانوی حکام نے اس سلسلے میں کوئی شہادت ظاہر کرنے یا مقدمے کے عوامل ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے۔

اگلے چند ہفتے، میں نے پریس فوٹوگرافروں اور رپورٹروں کو انٹرویو دینے اور اپنے عرب۔عراقی ساتھی کمانڈو بسم سے شادی کرنے کی تیاریوں میں صرف کئے۔ ہماری شادی ۲۶ نومبر ۱۹۷۰ء کو ہو گئی۔ چند ہفتے اکٹھے گزارے اور پھر دونوں اپنے اپنے کاموں پر واپس آ گئے۔

اگلے چند ہفتے، میں نے پریس فوٹوگرافروں اور رپورٹروں کو انٹرویو دینے اور اپنے عرب۔عراقی ساتھی کمانڈو بسم سے شادی کرنے کی تیاریوں میں صرف کئے۔ ہماری شادی ۲۶ نومبر ۱۹۷۰ء کو ہوگئی۔ چند ہفتے اکٹھے گزارے اور پھر دونوں اپنے اپنے کاموں پر واپس آگئے۔

لیلےٰ خالد فلسطینی مجاہدہ کا سارا خاندان صیہونیوں نے شہید کر دیا ہے۔ پہلے اس کے خاندان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔
اور اب جدوجہد فلسطین میں جان سے گذرنا پڑا ہے۔

لیلےٰ خالد کہ جس نے جہاز اغوا کرنے اور حریت پسندی میں بے مثل کردار ادا کرنے میں دنیا میں نام پایا۔
جس نے اپنے چہرے کی تین دفعہ پلاسٹک سرجری کروائی۔
چہرہ اور نام بدل کر جہاز اغوا کر کے سامراجیوں پہ فلسطینیوں کے عزائم آشکار کئے۔

لیلےٰ خالد کی آپ بیتی پہلی مرتبہ پاکستان میں شائع کی جا رہی ہے۔
لیلےٰ خالد کی زندگی اور کشور ناہید کا ترجمے کا اسلوب اس کتاب میں کمال عروج پر نظر آتے ہیں۔